فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۴۱

ماہ جنوری ۱۹۸۸ء تا جون ۱۹۸۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۱

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۸ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۸۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۴۱ ماہ جمادی الاولی ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۸ء عدد ۱

مضامین

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی وفات سے دار المصنفین کو جو شدید نقصان پہونچا ہے، اس کا پرہونا بہت دشوار ہے، اس لیے اس کے مستقبل کے بارہ میں اس کے معزز ارکان خصوصاً مجلس عاملہ کے صدر محترم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کو بڑی فکر و تشویش لاحق رہی، وہ چاہتے تھے کہ دار المصنفین کے اکثر ارکان کی موجودگی میں اس کے آیندہ طریقۂ کار اور لائحہ عمل کو طے کیا جائے، اس غرض سے وہ خود بعض عوارض اور نقرس کی شدید تکلیف کے باوجود سفر کی صعوبت برداشت کرکے دو بار دار المصنفین تشریف لائے، مگر اکثر ارکان ناگزیر اور طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں آسکے، آیندہ بھی ذرائع آمد و رفت کی مشکلات کی وجہ سے اعظم گڈھ میں ان حضرات کی تشریف آوری متیقن نہیں تھی، اس لیے ۳۰ر دسمبر ۸۷ء کو ہمدرد نگر، تغلق آباد، نئی دہلی میں دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہونا طے پایا تھا، تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ارکان شریک ہوکر دار المصنفین کی صلاح و فلاح اور اس کے استحکام کے لیے زریں مشورے دے سکیں،

۳۰ر دسمبر کا جلسہ نواب الحاج مولوی عبید الرحمٰن خان شروانی کی صدارت میں ہوا، اسمیں مجلس عاملہ کے صدر محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے علاوہ جناب حکیم عبد الحمید دہلوی، جناب محامد علی عباسی ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، (حیدرآباد) پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) مولانا سید محمد رابع ندوی (لکھنؤ) جناب سلمان سلطان (اعظم گڈھ) جناب سید شہاب الدین دسنوی اور راقم الحروف نے شرکت کی اور دار المصنفین کے نظم و نسق کے متعلق مفید اور اہم فیصلے کیے گئے اور اس کے نئے نظام پر بھی غور و خوض ہوا، اس کے تحت اس عاجز کو شعبۂ علمی کی نظامت اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کو انتظامی امور کی ذمہ داری سپرد کی گئی، ڈاکٹر محمد معظم جیراج پوری (اعظم گڈھ) مجلس انتظامیہ کے اور مولانا ابو العرفان ندوی (لکھنؤ) معارف کی مجلس ادارت کے نئے رکن منتخب ہوئے، اس موقع پر حکیم عبد الحمید صاحب نے خاص لطف و شفقت سے ارکان دار المصنفین کی پذیرائی اور ضیافت فرمائی جس کا اہتمام بڑے سلیقہ سے جناب سید اصاف علی ڈائرکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے کیا تھا، اس کے لیے ارکان دار المصنفین ان دونوں حضرات کے بہت ممنون ہیں۔

جناب سید شہاب الدین دسنوی کو دار المصنفین سے دیرینہ تعلق ہے، اور وہ انتظامی کاموں کا اچھا اور طویل تجربہ رکھتے ہیں، عرصۂ دراز تک بمبئی میں انجمن اسلام کے جنرل سکریٹری اور صابو صدیق پالی ٹکنک کے کامیاب اور نیک نام پرنسپل بھی رہے، ڈاکٹر محمد معظم مولانا اسلامت اللہ جیراج پوری کے پوتے اور مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے صاحبزادے ہیں اور شروع ہی سے دار المصنفین کے مخلص اور قدردان ہیں، مولانا ابو العرفان ندوی ندوۃ العلماء کے بہت ممتاز اور تجربہ کار استاد ہیں جو اچھا علمی و تعلیمی ذوق رکھنے کے علاوہ دار المصنفین کی خصوصیات سے بھی واقف ہیں، اس لیے ان سب حضرات کا انتخاب مناسب اور حق بحقدار رسید کے مصداق ہے، اور اس سے ان شاء اللہ دار المصنفین کو بڑا فائدہ پہونچے گا، مگر یہ عاجز کسی حیثیت سے اس منصب کا اہل نہ تھا، اس لیے اس کے انتخاب کو کبرنی موت الکبرا کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

راقم کو اپنی نااہلی کے احساس کے باوجود الامر فوق الادب کے بموجب اور دار المصنفین کے مفاد و مصالح کے پیش نظر اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑا، اس نازک اور مشکل موڑ پر اس کا اصل سہارا صرف خدا ہی کی ذات ہے، وعلیہ فلیتوکل المتوکلون، دار المصنفین کے معزز ارکان نے بھی از راہ لطف و کرم ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا ہے، بلاشبہ ان میں ایسے اصحاب علم و کمال موجود ہیں جن کی سرپرستی سے میرے نقائص کی تلافی ہوجائے گی، اور توقع ہے کہ ان کی رہنمائی میں دار المصنفین کی علمی خصوصیات بھی قائم و برقرار رہ سکیں گی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس نئے نظام کو دار المصنفین کے حق میں مفید اور بابرکت بنائے، اور اس علمی و تحقیقی ادارہ، بزرگوں کے ورثہ اور عظیم الشان دینی، ملی اور قومی امانت کو شر و فتن سے محفوظ رکھے، آمین۔

حرم پاک کے افسوسناک سانحہ پر معارف میں اظہار خیال کیا جاچکا ہے، دراصل یہ واقعہ اتنا سنگین ہے کہ اس کی وجہ سے ساری دنیا کے مسلمان مضطرب اور بے چین ہوگئے ہیں، ہندوستان کے مسلمان بھی دینی غیرت و حمیت میں کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں، اس لیے وہ بھی اس کے خلاف برابر اپنے غم و غصہ کا اظہار کررہے ہیں، اس سلسلہ میں وہ جلسے اور کانفرنسیں بھی کررہے ہیں، ۲۰ر ۲۱ر دسمبر کو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی

صدارت میں گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں بھی تقدس حرم کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح جناب عبدالرحمن خان نشتر جنرل سکریٹری اتر پردیش کانگریس کمیٹی (آئی) و وائس چیرمین قومی یکجہتی کونسل اتر پردیش نے کیا تھا، اس کی مجلسِ استقبالیہ کے چیرمین لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر محمد رضوان علوی اور کنوینر ڈاکٹر یونس نگرامی ندوی ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی تھے اور اس میں مختلف جامعات اور دینی مدارس کے نمایندے شریک تھے، دارالمصنفین سے راقم اور مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین نے شرکت کی تھی، یہ کانفرنس باوقار رہی اور اس میں مفید مقالات پڑھے گئے، اور اس کی اکثر تقریریں بھی سنجیدہ تھیں۔

بلاشبہ حرم کے تحفظ و تقدس کے لیے موثر کارروائی ضروری ہے، تاکہ آیندہ اس سرزمین پر کوئی تصادم اور خلفشار رونما نہ ہو، مگر اس معاملہ میں بڑے ہوش و تدبر اور اعتدال و احتیاط سے کام لینے اور بیجا جوش و خروش اور نفرت و اشتعال سے بچنے کی ضرورت ہے، جس کا مظاہرہ بعض جلسوں میں ہو رہا ہے، اس سے مسلمانوں کے افتراق و انتشار میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے، مسلمان تو خود ہی فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جس کا خمیازہ مختلف صورتوں میں بھگت رہے ہیں، مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق نہایت ضروری اور وقت کا اہم تقاضا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ بین الاقوامی شہرت کے قانون داں اور عالم جناب اے۔ کے۔ بروہی جن کا پورا نام اللہ بخش بروہی تھا، گذشتہ ستمبر میں عارضۂ قلب میں انتقال فرما گئے، ان کی میت لندن سے کراچی لائی گئی، ان کی عمر ۷۲ سال کی تھی، مرحوم کے بارہ میں یہ بالکل درست ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے وہ قانون داں، تربیت کے لحاظ سے فلسفی اور مزاج کے لحاظ سے دیندار تھے، ان کی قوت گویائی اعلیٰ درجہ کی تھی، ۱۹۶۰ء میں وہ پاکستان کے ہائی کمشنر ہو کر ہندوستان آئے، ان ہی دنوں ایک انڈو پاک کلچرل کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی جس میں پاکستان کے چوٹی کے ادیب، شاعر اور دانشور بھی آئے ہوئے تھے، افتتاحیہ جلسہ میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو شریک تھے، وہ بہت تھکے تھکے معلوم ہو رہے تھے لیکن جب بروہی صاحب تقریر کرنے لگے تو وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

بروہی صاحب نے اسلام آباد میں انٹرنیشنل یونیورسٹی قائم کی جس کے وہ پہلے ریکٹر ہوئے، پاکستان کی نیشنل ہجرہ کونسل کے چیرمین تھے جس کی وجہ سے حکومت نے انھیں سفیر کا درجہ دے رکھا تھا، وہ انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے، نیشنل ہجرہ کونسل کے چیرمین کی حیثیت سے وہ اسلام سے متعلق ایک سو اعلیٰ معیار کی کتابیں مرتب کرانے میں مصروف تھے، ان کتابوں کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ایک رکن مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن بھی تھے،

مقالات

اندلس کا اسلامی تمدن مستشرقین کی نظر میں

از

ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعۃ صدر دراسات علیا و بحث علمی جامعہ امارات عربیہ

ترجمہ: محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین

۱۹۷۶ء کی نصف خریف کے اواخر میں اسپین کی حکومت کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان علمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، یہ ہسپانوی تاریخ پر پہلی کانفرنس تھی، اور گو اس کا موضوع اسپین کی عام تاریخ تھا، تاہم اس میں اسلامی عہد حکمرانی کی تاریخ کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

ہسپانوی حکومت نے اس کانفرنس کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا، اس کے پانچ روزہ اجلاس اندلس کے تاریخی شہروں، اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ کی یونیورسٹیوں میں ہوئے کانفرنس کے لیے ان شہروں کے انتخاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اب بھی ہسپانوی حکومت اپنی تاریخ کا پرعظمت اور زریں زمانہ اسلامی عہد حکومت ہی کو سمجھتی ہے، ورنہ وہ موجودہ دور کے بڑے اور اہم شہروں کا انتخاب کر سکتی تھی، یا کم از کم موجودہ راجدھانی میڈریڈ یا، جدید تمدن اور ثقافت کے مرکز "برشلونہ" ہی میں اس کے ایک دو اجلاس کر دیتی۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے مسلمان عجیب اضطراب اور کشمکش میں مبتلا رہے، کیونکہ

جن شہروں میں اجلاس ہوئے ان سے ان کا جذباتی لگاؤ اور تعلق تھا، اس لیے ان پر حسرت و مسرت، وحشت و انسیت اور عبرت و موعظت کی ملی جلی کیفیتیں طاری رہیں، ان کو رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ انھیں کی غفلتوں نے یہ دن دکھایا کہ ان کے ایسے بے نظیر، پُرشوکت اور عظیم الشان شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے ہیں،

کانفرنس میں مسلم دانشوروں کی تعداد بہت کم تھی، جب کہ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین بڑی تعداد میں شریک تھے، پہلے تو ہم کو خیال ہوا کہ کانفرنس کا اہتمام کرنے والوں نے قصداً مسلمانوں کو نظر انداز کیا ہے، مگر ہمارا یہ گمان اس وقت غلط نکلا جب منتظمین نے ہم کو ان مسلم دانشوروں کی ایک طویل فہرست دکھلائی، جن کے نام دعوت نامے جاری کیے گئے تھے، یہی نہیں بلکہ جن ممالک سے وہ وابستہ تھے، ان کی حکومتوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

اس کانفرنس میں شیکاگو یونیورسٹی سے وابستہ ایک مستشرق ڈاکٹر سمیٹ بھی شریک ہوئے تھے یہ وہ سمیث نہیں ہیں جن کی مشہور کتاب "الاسلام والعصر الحدیث" ہے، اور نہ یہ اسلامی آثار کے مشہور عالم "سمیث ہیں"، جو درسگاہ سمیتھ سونیان سے وابستہ ہیں، اور جن کے اسلامی علوم و فنون سے متعلق لکچروں نے امریکہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک بڑی تعداد کو قبول اسلام پر آمادہ کیا ہے، بلکہ یہ ان کے علاوہ کوئی تیسرے شخص تھے ان کا پورا مقالہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت سے بھرا ہوا تھا، جس کو انھوں نے نہایت کریہ لب لہجہ سے پڑھا، مقالہ کا اختتام اس جملہ پر ہوا تھا۔

"اپنے ملک سے عربوں اور مسلمانوں کو نکال بھگانا ہسپانوی قوم کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ ہے"۔

ڈاکٹر سمیث کی باتیں اگر ایک طرف تاریخی حقائق کے خلاف تھیں، تو دوسری طرف ڈکانفرنس

اور اس کے شرکا کے لیے اہانت آمیز بھی تھیں، انداز گفتگو کی ناشائستگی اس پر مستزاد تھی جو قطعاً کسی علمی کانفرنس کے شایانِ شان نہ تھی۔

ڈاکٹر سمیث کے اس رویہ کو دیکھکر مجھے اسلامی علوم و فنون پر منعقد ہونے والی ایک دوسری کانفرنس کا ایک واقعہ یاد آگیا، جو اسی صدی کی پچاسویں دہائی کے اخیر میں کراچی میں منعقد ہوئی تھی، اور اس میں ایک یہودی مستشرق "جرونباوم" شریک ہوا تھا، اس شخص کا مقالہ بھی مذہب اسلام اور پیروان اسلام کے خلاف نفرت و عداوت کا مظہر تھا، اس کی وجہ سے کانفرنس کے شرکا بہت برہم ہوئے، اور انھوں نے اس کی سخت مذمت کی گو کچھ لوگ اسکے لیے نرم گوشہ بھی رکھتے تھے، مگر حکومت پاکستان نے انتہائی ناگواری کے ساتھ اس شخص کو کانفرنس سے اٹھا دیا تھا۔ اور اسے اپنے وطن واپس ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ظاہر ہے قرطبہ میں یہ صورت ممکن نہ تھی، لیکن اتنا ضرور کیا جا سکتا تھا کہ اس شخص کے خلاف سخت احتجاج کیا جاتا، اس کی رائے کی تردید کی جاتی، اور اس کے ناشائستہ انداز بیان کی مذمت کی جاتی، لیکن ہمیں ان باتوں کی تردید کی ابھی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اسٹیج پر اسپین ہی کے ایک مشہور مستشرق ڈاکٹر بدرو مونتاییث استاد مڈریڈ یونیورسٹی نمودار ہوئے، اور انھوں نے بڑے سخت اور درشت لب و لہجہ میں اس امریکی مستشرق کی تردید کی، اور اسے جاہل مطلق قرار دیتے ہوئے، کہا کہ نہ اس شخص نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اور نہ اسے اس کا کوئی فہم و ادراک ہی حاصل ہے، ڈاکٹر بدرو مونتاییت نے اپنی بات اس پر ختم کی کہ۔

"اسپین کی ثقافت و تمدن کی تاریخ ان آٹھ صدیوں کو شامل کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی جو اس نے اسلام اور اسلامی تمدن کے سایہ میں گذاری ہیں اسی زریں دور میں اسپین نے اپنے قریب کے ان یورپین ممالک کو بھی ثقافت، تمدن اور تہذیب کا چراغ دکھایا تھا جب وہ علمی حیثیت سے

نہایت پس ماندہ اور جہالت اور لاعلمی کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔"

ڈاکٹر مونتانیت کے پرزور لب و لہجہ میں اس قدر مدلل جواب کے بعد ہمیں تردید کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہی، اور اس کانفرنس اور اس کے شرکاء پر بہت اچھا اثر بھی ہوا کہ ایک مستشرق کی تردید خود ایک مستشرق نے اتنے خوبصورت انداز میں کردی، تاہم ایک مستشرق کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے باعث حیرت و عبرت ضرور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انصاف پسند مستشرق ڈاکٹر پدرو مونتانیت، اسپین کے مشہور مستشرق فرانسسکو کوڈیرا کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جس سے وہاں کے معتدل اور انصاف پسند مستشرقین کی ایک بڑی تعداد وابستہ تھی، جو "بنی کوڈیرا" کے لقب سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنی تصانیف میں اسپین کی اسلامی تاریخ کو نمایاں حیثیت دی ہے۔

حق و انصاف پسند مستشرقین کے اور بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں جن سے انکی میانہ روی اور علم و تحقیق کے میدان میں عدل پسندی کا ثبوت بہم پہونچتا ہے، چنانچہ مغربی برلن یونیورسٹی کے استاد اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ کے صدر ڈاکٹر فرٹز اسٹیپاٹ کو ۱۹۸۰ء میں جرمن مستشرقین کی ایک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی، یہ کانفرنس برلن ہی کی پبلک لائبریری میں منعقد ہوئی تھی، عموماً مستشرقین کی کانفرنسوں کا موضوع اسلامی عقائد و تعلیمات، اسلامی تہذیب و ثقافت اور اس کی تاریخ ہوا کرتا ہے، اور اکثر ان میں ان امور پر نکتہ چینی ہی کی جاتی ہے، اس کانفرنس میں ڈاکٹر فرٹز اسٹیپاٹ نے موجودہ مسلم معاشرہ کی سیاسی، اجتماعی اور ثقافتی حالت کا جائزہ لیکر انتہائی تلخ حقائق پیش کیے تھے، اس سے ان کے ان رفقاء کو سخت حیرت ہوئی، جو ان کے طریقۂ بحث و گفتگو کی متانت اور ان کی اعتدال پسندی سے واقف تھے، مگر ان کے اختتامیہ کلمات نے سامعین کی حیرت کو خوشی میں تبدیل کردیا، انھوں نے کہا۔

"حضرات! میں نے موجودہ مسلم معاشرہ کا تجزیہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ

موجودہ پراگندہ خیال مسلمانوں کے طرزِ عمل پر اسلام کو نہ قیاس کریں، کیونکہ انھوں نے اپنے مقصد و منصب سے منہ موڑ لیا ہے۔ اسلام تو دراصل تدبر، علم، ثقافت، تمدن، عدل، انصاف اور ترقی کا مذہب ہے، جن سے موجودہ مسلمانوں کا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے، اب بھی اگر وہ صحیح معنوں میں اسلام پر عمل پیرا ہوجائیں، تو ان کی اصلاح ممکن ہے، اور ان کے حالات بدل سکتے ہیں، اور وہ دوبارہ دنیا کی قیادت کے اہل ثابت ہوسکتے ہیں۔"

جرمنی ہی کا ایک اور واقعہ ہے کہ وہاں کی ارلنجن یونیورسٹی کے علوم و آداب کے صدر شعبہ ...... ڈاکٹر فریڈرک فیشر نے اپنے ایک ماتحت پروفیسر لوبیخ کو صرف اس بنیاد پر انکے عہدے سے برطرف کردیا تھا، کہ وہ اپنی تحریروں میں قرآن مجید پر سخت اور ناروا تنقیدیں کیا کرتا تھا، لوبیخ نے اپنی برطرفی کا معاملہ جرمنی کی ایک عدالت میں پیش کیا۔ اس نے بھی ڈاکٹر فیشر ہی کے حق میں فیصلہ دیا۔

لیکن اس قسم کے مستشرقین بہت کم ہیں جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، ان کے مقابلہ میں ایسے مستشرقین بہت زیادہ ہیں جن کا مطمحِ نظر ہی اسلام دشمنی، اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی، حقائق و مسلمات کا انکار اور ان میں التباس و اشتباہ پیدا کرنا اور مسلمانوں کے اہم اشخاص و افراد کی سیرتوں کو مجروح کرنا ہے۔

اعتدال و انصاف پسند مستشرقین میں برطانیہ کے سر تھامس آرنلڈ، آربری، گلیوم اور ماسینیون، جاک بیرک اور بلاشیر کے نام سرفہرست ہیں، اس فہرست میں دو اور فرانسیسی مفکرین ڈاکٹر روجیہ جارودی اور موریس بوکائی کے ناموں کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنی سلامت روی اور انصاف پسندی کی وجہ سے اپنے لیے اسلام اور مسیحیت کا راستہ اختیار کیا۔

اسپین کے انصاف پسند مستشرقین کی فہرست میں سب سے پہلا نام فرنسسکو کوڈیرا (۱۸۳۶ء-۱۹۱۷ء) کا ہے پھر اس کے وہ شاگرد جنھوں نے اپنے لیے بنی کوڈیرا کا لقب اختیار کرنا پسند کیا تھا، جیسے جولیان ربیر اسپین پلاثیوس مانخل جنثالث پالنثیا، اور جارینا جومس وغیرہ۔

مستشرقین کی اس مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کا بڑا طبقہ اسلامی عقائد وتعلیمات اور اسلامی ثقافت وتمدن کے تئیں سخت نفرت وعداوت رکھتا ہے، چنانچہ اسلام کے پیچیدہ اور نازک مباحث ہی کو اپنی بحث وگفتگو کا موضوع بناتے ہیں، اگر اس سے بھی ان کا مطلب نہیں نکلتا ہے، تو وہ خود اپنے جی سے بھی فرضی واقعات گھڑ لیا کرتے ہیں، غلط بیانی اور غلط ترجمانی تو ان کا عام شیوہ ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم وتحقیق کے میدان میں کام کرنے والے دانشوروں کے اس طبقہ میں یہ غلط انداز کیوں پایا جاتا ہے، اس کا صحیح اور سہل جواب یہ ہے کہ سلسلۂ استشراق اصلاً مذہب اسلام کے دو اہم دشمنوں کی پیداوار ہے، صلیبی مشنریاں اور استعمار، ان دونوں سے وابستہ اشخاص سلامت روی پر قائم نہیں رہ سکتے، خواہ مسند علم وتحقیق ہی پر کیوں نہ فائز ہوں متعصب مستشرقین کے حق میں یہ کچھ زیادتی اور ناانصافی کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ وہ حقائق کی غلط تعبیر کرتے اور پسندیدہ امور کا گلا گھونٹتے ہیں، اور ہمارے خیال میں یہ لوگ سخت مجرم ہیں، اور ان کا جرم انسانی خونریزی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اسلامی تاریخ کے متعلق عام مستشرقین کا طریقہ یہی ہے، لیکن اندلس اور جنوبی یورپ کی تاریخ کے بارہ میں ان کا رویہ کسی قدر مختلف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس بارہ میں خود ان کے درمیان اختلاف ہے، اور اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر بحث وتحقیق کرنے والے مستشرقین کی نشو ونما دو مختلف مکتب فکر کے زیر اثر ہوئی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں،

تاہم یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، کہ دونوں فرقوں کے درمیان عام اسلامی تاریخ یا صرف اندلس کے اسلامی دور حکومت کے واقعات اور تمدنی اور فکری امور و مباحث میں ضرور اختلاف ہی ہو، بلکہ یہ اختلاف نقطۂ نظر کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے، اس لیے انکے ایک فریق کے خیال میں ہسپانوی تاریخ میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ دور بڑی اہمیت کا حامل ہے، جس کو جزیرہ نما ایبریا کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، اس فریق کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہسپانوی قوم کی ایک بڑی تعداد اپنے طبقاتی اور نسلی تحفظ کے باوجود مذہب اسلام کی تابع رہی ہے۔

اس نقطۂ نظر کے حامل مستشرقین کی بحث وگفتگو سنجیدہ اور علمی ہوتی ہے، مگر ان کی تعداد بہت مختصر ہے، اسی طبقہ کے سرخیل مدرسۂ بنی کوڈیرا کے لوگ ہیں، جو اسپین کی تاریخ میں اسلامی عہد حکمرانی کو خاص اہمیت دیتے ہیں، اور اس کو نظر انداز کیے جانے کو اپنی تاریخ کا زبردست زیاں تصور کرتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام دشمن نقطۂ نظر رکھنے والے اسپین کے اسلامی عہد کو سامراجی بتا کر اس کو اس کی تاریخ سے جدا قرار دیتے ہیں، مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اسی نقطۂ نظر کا حامی ہے اور چنانچہ یہ طبقہ اپنے موقف کی تائید میں تمام ممکن وسائل استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ فرضی واقعات کو بھی بنیاد بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا، خواہ وہ تاریخی حقائق کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، اس طبقہ کا سب سے اہم سربراہ مستشرق رینہارٹ ڈوزی تھا، جو اسپین کے بجائے ہالینڈ کا رہنے والا تھا، اور اس کا ہم نوا ایک ہسپانوی مستشرق فرانسسکو سیمونیٹ تھا، جس کے بعض خیالات پر تفصیل سے تبصرہ کیا جائے گا۔

مستشرقین کے حلقہ میں اسپین کی اسلامی تاریخ پر بحث وگفتگو اور نقد وتبصرہ کا آغاز اس وقت ہوا، جب بارھویں صدی عیسوی کے مؤرخ جوان انڈرس کی کتاب "یورپین اقوام کے اصول ارتقاء"

شائع ہوئی، یہ اسپین ہی کا ایک پوپ تھا، اور اس نے اپنی یہ کتاب جو آٹھ جلدوں پر مشتمل تھی، اطالوی زبان میں لکھی تھی، اس کتاب میں متعدد ادبی، فکری اور تاریخی مباحث زیر بحث آئے ہیں جن کے ضمن میں ہسپانوی تاریخ کے تعلق سے یورپی تہذیب پر عربوں اور مسلمانوں کے اثرات بھی دکھائے گئے ہیں، اس سے خاص طور پر اسکے معاصر اطالوی مستشرقین اس پر سخت برہم ہوئے، اور اس کی تردید میں لگ گئے، یہیں سے اندلس کی اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا سلسلہ انکے یہاں چل پڑا، اور انیسویں صدی کے آتے آتے یہ سلسلہ استشراق کا ایک اہم موضوع ہو گیا، چنانچہ مستشرقین کی پوری ایک جماعت نے اس موضوع کو اپنا لیا، اور اس بارہ میں ان کے کئی مکتب فکر بھی ہو گئے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ مستشرقین کا وہ طبقہ جس کا مطمح نظر ہی اسلام دشمنی ہے، اس میں سرفہرست مستشرق رینہارت ڈوزی ہے، گو ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے، کہ اس کے طریقۂ تحریر اور اسلوب بیان میں تاریخی تسلسل ہے، مگر اس کے پیش کردہ نتائج صحیح نہیں ہوتے بلکہ یہ نہایت غیر منصفانہ اور پہلے سے طے کردہ ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اکثر ایسے فرضی واقعات پر مبنی ہیں، جن کی متداول تاریخی مآخذ سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔

اس شخص کی اسلام دشمنی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ دین بیزار تھا، اس کو کلیسا اور مذہبی پیشواؤں سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ ہوئی کہ مذہب اسلام سے بھی اسکو عداوت ہو گئی مگر ہمارے خیال میں یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ کسی شخص کی مسیحیت سے بیزاری تمام ہی مذاہب سے اسکے بعد و نفرت کی وجہ نہیں بن سکتی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ شخص نفسیاتی مریض تھا اس کو اسلام سے صرف اس وجہ سے نفرت تھی کہ اس کے ملک کے تمدن کے بجائے، کیوں اس کا تمدن ہسپانوی قوم کی فضیلت و ترقی کا سبب بنا۔

یوں تو ڈوزی کی اکثر باتیں غلط ہیں، مگر اس کا سب سے غلط رویہ یہ ہے کہ اس نے ملوک طوائف خصوصاً اشبیلیہ کے حکمران بنی عباد کی نہایت مدح سرائی کی ہے، اور ان کے مقابلہ میں مرابطین پر سخت تنقید کر کے ان کو متہم و مجروح کیا ہے، جب کہ تاریخ اندلس کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے اس کی تردید ہوتی ہے اور اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اندلس کی اسلامی حکومت ملوک طوائف کی باہمی کشمکش اور سرکشی کے نتیجہ میں نہایت کمزور ہو گئی تھی اس نازک دور میں مرابطین نے پوری جدوجہد اور نہایت جانفشانی سے اندلس کو ازسرنو متحد و منظم کرنے کی کوشش کی، اس طرح انھوں نے نااہل ملوک طوائف کے اقتدار کو ختم کر کے دوبارہ اس سرزمین پر اسلامی ثقافت و تمدن کا احیا کیا تھا۔

تاریخ اندلس پر ڈوزی کی کئی کتابیں ہیں، جن میں سب سے مشہور "تاریخ مسلمانان اسپین" ہے جو خود اسی نے ۱۸۶۱ء میں شائع کی تھی، اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں مستشرق لیوی پروفنسال کے ہاتھوں شائع ہوا ہے، اور اس کی دوسری اہم کتاب "تاریخ بنی عباد" ہے جو ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی ہے، ان کے علاوہ اس نے اندلس کے مندرجہ ذیل قدیم ادبی و تاریخی مآخذ بھی شائع کئے ہیں۔

(۱) البیان المغرب لابن عذاری۔ (۲) المعجب لعبد الواحد المراکشی (۳) الحلۃ السیراء لابن ابار (صرف وہ حصہ جو اندلس سے متعلق ہے) (۴) نزہۃ المشتاق للادریسی (صرف ایک حصہ) (۵) شرح قصیدہ ابن عبدون لابن بدرون۔ وغیرہ۔

اندلس نے اسلامی علوم و فنون کی جو شاندار خدمت انجام دی ہے، ڈوزی نے بلاشبہ انکی تحقیق میں کافی عرق ریزی کی ہے، خصوصاً مآخذ کی نشاندہی اور ان کے متون کی ترتیب و اشاعت اس کا بہت اہم اور قابل قدر کارنامہ ہے، مگر اس کے مقدمے میں جس غلط بیانی سے کام

لیا گیا ہے، اور اس نے اسلامی تہذیب و تمدن کی جو بدنما تصویر پیش کی ہے، اس سے اس کے مذموم ارادہ اور بدنیتی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈوزی کی ہمنوائی اس کے بعض معاصر ہسپانوی مستشرقین نے بھی کی ہے، چنانچہ انھوں نے بھی تاریخی واقعات کی غلط ترجمانی اور من گھڑت افسانے وضع کر کے، مسلمانوں اور مسلم سربراہوں کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مستشرقین میں ایزدورد الباجی اور خوسیہ انطونیوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گو ثانی الذکر کا رویہ کسی حد تک غنیمت ہے، تاہم اس کی بھی کتاب "ہسپانیہ میں عرب سامراج" اسلامی دشمنی ہی پر مبنی ہے، جس میں اس نے ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ و تمدن کے ابواب میں بڑی غلط بیانیاں کی ہیں، تاہم اس نے جابجا ڈوزی کے خیالات اور طریقۂ بحث و گفتگو پر تنقید کر کے اس کی علمی خیانت اور موضوع سے اس کے انحراف کو بھی ثابت کیا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور ہسپانوی مستشرق جافیر سیمونیٹ کا بھی نام آتا ہے، جس نے اندلس پر دو ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اس کی ایک کتاب "گلوساریو" کی حیثیت ایک ڈکشنری کی ہے، جس میں اس نے ایبیری اور لاطینی زبانوں کے وہ الفاظ اور جملے اکٹھا کر دئے ہیں، جو اندلس کے عرب مسلمانوں میں رائج تھے، اس سے اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اندلس کے عرب مسلمان خود ہی لاطینی تہذیب و تمدن سے متأثر تھے، اس لئے کہ اس پر ان کے اثر انداز ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ کتاب ۱۸۸۸ء میں مدریڈ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی دوسری کتاب "اسپین کے عرب مسلمانوں کی تاریخ" ہے، اس میں اس نے مذہب اسلام اور اسلامی ثقافت و تمدن کے خلاف اپنی شدید نفرت کا اظہار کیا ہے، اور مسلمانوں کے تمام تمدنی کارناموں کو مہمل اور لغو قرار دیا ہے، یہ کتاب بھی مدریڈ ہی سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی، اس مقالہ کے آخیر میں اس پر تبصرہ کیا جائے گا۔

انیسویں صدی عیسوی ہی میں جب کہ مستشرقین کا یہ پورہ گروہ اسلامی ثقافت و تمدن کے خلاف زہر افشانی میں مشغول تھا، اسی زمانہ میں خود اسپین میں ایک وسیع النظر اور ذی علم مستشرق پاسکوئل دگیانگوس (۱۸۰۹ء-۱۸۹۷ء) بھی گذرا ہے۔ یہ دنیا کی کئی رائج زبانوں سے واقف اور ان کا ماہر تھا، عربی سے بھی اس کو مکمل واقفیت تھی، اس بنا پر اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اسپین میں اسلامی افکار و نظریات اور اسلامی ثقافت و تمدن کے اثرات کسقدر وسیع اور گہرے ہیں۔

دگیانگوس نے گوناگوں علمی کام انجام دئے، اس کا سب سے اہم کارنامہ "اسپین میں اسلامی مملکتوں کی تاریخ" ہے، یہ کتاب انیسویں صدی کی چالیسویں دہائی کے اوائل میں لندن سے شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ اس نے اپنے دور کے ترقی یافتہ ممالک کو ہسپانوی مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے تمدنی کارناموں سے روشناس کرانے کے لئے "نفح الطیب" کا انگریزی ترجمہ کیا۔ جو اندلس کی تاریخ پر سب سے اہم اور مستند کتاب خیال کی جاتی ہے، اس کتاب کا ترجمہ وہ ہسپانوی زبان میں بھی کر سکتا تھا۔ مگر اس نے انگریزی کو اس لیے ترجیح دی کہ یہی زبان اس وقت یورپ کے اکثر ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، پس اس کتاب کے عام فائدہ کے لیے اس کا انگریزی ترجمہ ہی مناسب اور سود مند ہو سکتا تھا۔

جایانجوس کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے تلامذہ میں علمی بحث و تحقیق کا رجحان پیدا کیا، جس کے نتیجہ میں عربی علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا، اس کا ایک شاگرد مدرسہ بنی کوڈیرا کا بانی فرانسسکو کوڈیرا تھا[1]، یہ نام اندلس کی تاریخ سے ادنی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی نامانوس اور غیر معروف نہیں ہے،

کوڈیرا کا پورا نام "فرانسسکو ڈیرا ازیدیا" تھا۔ اس کو عربوں سے بہت محبت تھی، کہا جاتا ہے کہ اسپین کے بعض گھرانوں کی طرح اس کے بھی آباء و اجداد عرب تھے، ڈ اپنے نام میں

[1] مجلہ فصول۔ بحث الاندلس فی شعر شوقی، از ڈاکٹر محمود مکی۔ ص ۲۰۰ و ۲۳۴۔

کوڈیرا کو عربی تلفظ کے مطابق قدیرہ کہلانا زیادہ پسند کرتا تھا، امیر شکیب ارسلان مرحوم جب اس کا نام لیتے تھے، تو اس کو قدیرہ کہتے تھے،

انیسویں صدی میں مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اندلس کو اپنا موضوع بنالیا تھا، مگر کوڈیرا کی شخصیت ان سب میں نمایاں اور منفرد تھی، اس کے ذاتی کتب خانے میں عربی کے نادر اور بیش قیمت مخطوطات کا ایک ذخیرہ تھا، جس کا بڑا حصہ اندلس کی اسلامی تاریخ سے متعلق تھا، اندلس کی عرب سلطنتوں میں رائج سکوں کو بھی اس نے کافی مقدار میں جمع کر رکھا تھا جن کا ذکر اس نے اپنی ایک کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے، مڈریڈ یونیورسٹی میں استاد تھا، اپنی بے سروسامانی کے باوجود بھی اس نے اپنے لائق شاگرد جولیان ریبیرا کے تعاون سے زر کثیر صرف کرکے اندلس کی تاریخ کے متعدد مراجعات کو اہتمام سے شائع کیا جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) الصلۃ لابن بشکوال۔ (۲) التکملۃ لابن ابار۔ (۳) المعجم فی اصحاب ابن علی الصدفی۔ (۴) بغیۃ الملتمس ملضبی۔ (۵) تاریخ علماء الاندلس لابن الفرضی۔ (۶) فہرست ما رواہ ابن خاجی الخلیفۃ عن شیوخہ۔

وہ ان کتابوں کو اندلس کا کتب خانہ کہتا تھا، اور اس امر سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے کہ یہ تمام کتابیں اندلس کی تاریخ کا مستند اور بہتر ماخذ ہیں جن سے اس موضوع پر کام کرنے والا کوئی بھی محقق بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ کوڈیرا نے ان کو شائع کرنے کے علاوہ خود بھی تاریخ اندلس پر کئی کتابیں لکھیں اور یہ سب کی سب غلط بیانیوں سے خالی ہیں،

ہمارے خیال میں مستشرقین کی پوری جماعت میں کوڈیرا ہی تنہا ایسا فرد واحد ہے جس نے مسلمانوں کے عظیم الشان کارناموں کا نہ صرف فراخدلی سے اعتراف کیا، بلکہ اس نے ان کی تعریف وتحسین بھی کی ہے، اور انھیں بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے، چنانچہ وہ

کھل کر اعتراف کرتا ہے کہ ثقافت وتمدن اور آثار کی حفاظت مسلمانوں ہی نے کی ہے، وہ اپنی کتاب "اندلس کی اسلامی تاریخ" جلد دوم میں لکھتا ہے:۔

"عہد وسطیٰ اور اس کے قبل دنیا کی تمام قوموں میں عرب (مسلمان) علم کے سب سے زیادہ شیدائی تھے اور اس عہد میں انھوں نے علم وفن کے ہر میدان میں بکثرت کتابیں لکھی ہیں"

اس سے بڑھ کر کوڈیرا کی انصاف پسندی کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے خود یورپ کو عربی ثقافت وتمدن اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، چنانچہ جمیس مونرو نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

"اسپین کو یورپ کی تہذیب وتمدن کو نہیں اپنانا چاہئے، بلکہ خود یورپ کو عربی ثقافت وتہذیب اختیار کرنی چاہئے۔ اسی صورت میں اسپین اپنی قدیم تاریخی روایت کو دہرا سکتا ہے۔"[۱]

کوڈیرا کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:۔ (۱) تاریخ مسلمانان نمرلونہ چرندہ و برشلونہ، (۲) سلطنت مرابطین کا اضمحلال اور سقوط (۳) تاریخ اندلس کا ایک تنقیدی مطالعہ۔

بنی کوڈیرا اسکول | کوڈیرا کا عظیم الشان اور خراج تحسین پیش کئے جانے کے لائق کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ اندلس پر ایک خاص مکتب فکر اور مستقل اسکول قائم کیا، جس سے وابستہ ہوکر مستشرقین کے حلقہ نے اندلس کی اسلامی تاریخ کو اپنا موضوع قرار دیا، یہ لوگ کوڈیرا کے نقش قدم کا تتبع کرتے تھے، اور اس کی جانب انتساب کے باعث باہم اس طرح متحد اور مربوط ہوگئے تھے گویا یہ سب ایک خاندان کے بھائی بند ہوں، اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، انھوں نے

[۱] الاسلام والعرب فی دراسات العلماء الاسبان، سوانح کوڈیرا۔

اپنے امتیاز و تشخص کے لیے بنی کوڈیرا کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا۔

کوڈیرا کے سب سے محبوب اور چہیتے شاگرد جولیان ریبیرا (۱۸۵۸ء-۱۹۳۵ء) تھے، یہ اندلس کے مشہور تاریخی شہر بلنسیہ میں پیدا ہوئے، ایک زمانے تک سرقسطہ یونیورسٹی پھر مڈریڈ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد رہے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ اپنے وطن بلنسیہ چلے آئے اور وہاں بھی علم و فن کی خدمت میں لگے رہے۔ اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ کوڈیرا نے اندلس کے مآخذ سے متعلق کتابوں کی تحقیق و اشاعت ریبیرا کے تعاون سے کی تھی، ہمارے خیال میں اس عظیم کارنامے میں ریبیرا ایک شریک غالب کی حیثیت سے شامل تھے، ان کے علمی مذاق کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی تحویل میں اطالوی مستشرق لیون کاے تانی کے متفرق مضامین کا وہ مجموعہ بھی تھا، جو اندلس کے مسلمان علماء اور ادباء کے حالات زندگی پر مشتمل ہے[1]۔

ریبیرا کے علمی کارناموں میں "قضاۃ قرطبہ" للخشنی اور دیوان ابن قزمان کی تحقیق کے علاوہ ابن القوطیہ کی کتاب "تاریخ افتتاح الاندلس" کی تحقیق اور اس کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ بھی شامل ہے، اندلسی اشعار و موسیقی سے بھی اس کو خاص دلچسپی تھی، اور اس موضوع پر بھی اس نے متعدد مقالات لکھے ہیں۔

بنی کوڈیرا اسکول کے دوسرے اہم شخص آسن پلاثیوس تھے، یہ عیسائیوں کے لاہوتی طبقہ کے ایک پوپ تھے، اور اسی وجہ سے ان کو مسلم فلاسفہ اور صوفیہ کے سوانح کے مطالعہ کا زیادہ شوق تھا، چنانچہ ان کی اکثر کتابیں اسی موضوع پر ہیں، جیسے "ابن باجہ سرقسطی" "ابن مسرہ اور ان کا مکتب فکر" "محی الدین بن عربی" اور "ابن حزم قرطبی اور ان کے دینی رجحانات" وغیرہ۔

[1] الاعلام - الزرکلی، مادہ لیون کاے تانی۔

ان کے علاوہ اپنے بزرگوں کے تتبع میں انھوں نے بھی کافی قدیم کتابیں شائع کی ہیں، اور ان کے ترجمے کیے ہیں، چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں علامہ ابن حزم کی کتاب "الاخلاق والسیر فی مداواۃ النفوس" کو مڈریڈ سے شائع کیا، پھر ۱۹۴۰ء میں ابن سید بطلیوسی کی کتاب الحدائق بھی طبع کرائی اور اس پر ہسپانوی زبان میں مقدمہ لکھا۔

لیکن پلاثیوس کا شاہکار کارنامہ ان کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی کے اسلامی مصادر" ہے۔ یہ کتاب دو مرتبہ ۱۹۱۹ء پھر ۱۹۴۳ء میں مڈریڈ سے شائع ہو چکی ہے، اس میں انھوں نے عہد وسطیٰ کے مشہور مسیحی شاعر دانتے کی شہرۂ آفاق رزمیہ نظم "ڈوائن کمیڈمی" کا جائزہ لیا ہے۔ یہ نظم یورپ میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دانتے کا نتیجۂ فکر ہے، مگر پلاثیوس نے اپنی اس کتاب میں اس کو غلط ثابت کیا ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ نظم ہر اعتبار سے واقعۂ اسراء اور معراج سے ماخوذ ہے، گو دونوں کے مقاصد جدا جدا ہیں، اور اس امر پر انھوں نے کافی دلیلیں فراہم کی ہیں، انھوں نے نظم کے تمام واقعات و مناظر پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور ہر واقعہ اور منظر کی مطابقت قصۂ معراج سے دکھلائی ہے۔

اس اسکول کے تیسرے فرد انخل جنثالث پالنثیا تھے، ان کے کارنامے بہت تھوڑے ہیں وہ بھی بہت جامع اور قابل قدر ہیں، یہ بھی اپنے مرشد کوڈیرا اور اپنے دونوں ساتھیوں کے مانند اسپین کی تاریخ کا زریں عہد اسلامی عہد ہی کو سمجھتے تھے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں جولیان ریبیرا مڈریڈ یونیورسٹی سے علحدہ ہو گئے تھے، ان کی علحدگی کے بعد یہ ان کی جگہ وہاں استاد مقرر ہوئے، کیونکہ ان کو علمی بحث و تحقیق کے علاوہ درس و تدریس سے بھی خاص دلچسپی تھی، علمی بحث و تحقیق کے میدان میں انھوں نے گوناگوں کارنامے انجام دیئے ہیں، جن میں قدیم کتابوں کی تحقیق، ان کے ترجمے اور ان کی نشر و اشاعت کے علاوہ خود ان کی کئی کتابیں

شامل ہیں، چنانچہ مشہور فلسفی ادیب اور اپنے وقت کے نامور طبیب ابوبکر بن طفیل کی کتاب "قصہ حی بن یقظان" کا انھوں نے اسپینی زبان میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ ابی الصلت امیہ بن عبدالعزیز الدانی کی کتاب "تقویم الذہن فی المنطق بھی انہی نے مڈریڈ سے ۱۹۴۷ء میں شائع کی ہے۔

البتہ ان کی اپنی کتابیں ہمارے علم میں صرف دو ہیں، ۱۔ "اسپین کی اسلامی تاریخ" اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کا آخری ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں برشلونہ سے شائع ہوا۔ (۲) "اسپین کے عربی ادب کی تاریخ" اس کتاب کا ترجمہ اندلسی تاریخ کے عظیم محقق ڈاکٹر حسین مونس نے عربی میں کیا ہے، اور یہ کتاب "تاریخ الفکر الاندلسی" کے نام سے شائع ہوئی ہے، انھوں نے کتاب کا نام بدل دیا کیونکہ ان کی رائے میں یہ کتاب صرف ادبی موضوعات ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں اندلس کی پوری تاریخ پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جس میں فلسفہ تصوف، طب، سفرنامے کے علاوہ علم نباتات، علم الافلاک اور ریاضی وغیرہ متنوع موضوعات شامل ہیں۔[1] اس جامعیت کی وجہ سے یہ کتاب صرف ادب ہی کے دائرہ تک محدود نہ رہی بلکہ اندلس کے افکار و نظریات پر ایک تاریخی دستاویز ہو گئی ہے جس میں پالنشیا نے اندلس کے افکار کی بہت عمدہ ترجمانی کی ہے، گو اس کتاب کے بعض مباحث سے ہم کو اتفاق نہیں ہے، تاہم یہ اعتراف بھی ہے کہ ان میں نہ تعصب سے کام لیا گیا ہے، اور نہ ہی یہ خود ساختہ ہیں

اس سلسلہ کی آخری کڑی جاریثا جومس پر ختم ہوتی ہے، یہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے، کوڈیرا کے انتقال کے وقت یہ صرف بارہ[12] برس کے تھے، اس طرح وہ کوڈیرا کے براہ راست شاگرد نہیں تھے، لیکن جولیان ریبیرا سے ان کو شرف تلمذ حاصل تھا، انھوں نے بھی اپنے بزرگوں کے

[1] الفکر الاندلسی، مقدمہ۔ ص۔ و

نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے اندلس کی اسلامی تاریخ کا تعارف کرایا ہے، اور متعدد قدیم مراجع کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، ان کی بعض اہم کتابیں یہ ہیں۔

(۱) اندلسی اشعار کے منتخب قصائد۔ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔ (۲) قرطاجنی کے قصیدہ مقصورہ پر تعلیقات و حواشی۔ مطبوعہ ۱۹۳۳ء۔ (۳) ابواسحاق البیری کے دیوان کی تحقیق مع تعلیقات اور ترجمہ، مطبوعہ از غرناطہ ۱۹۴۲ء۔ (۴) علامہ ابن حزم کی کتاب الاخلاق والسیر کا ترجمہ، مطبوعہ از مڈریڈ ۱۹۵۳ء۔ (۵) ابن سعید کی رایات المبرزین وشارات الممیزین کی تحقیق و اشاعت اور ترجمہ۔ مطبوعہ از مڈریڈ ۱۹۴۲ء۔ (۶) الشقندی کے رسالہ فی فضل الاندلس کا ترجمہ۔ مطبوعہ۔ از مڈریڈ ۱۹۳۳ء۔

اندلس کے اسلامی تمدن کی تاریخ لکھنے والے انصاف پسند ان مستشرقین کی فہرست میں عہد حاضر کے ایک مستشرق امیریکو کاسترو کا بھی نام لیا جا سکتا ہے، جو کوڈیرا اور دگیا نگوس ہی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ابھی چند برسوں پہلے ان کا انتقال ہوا ہے، ان کی سب سے اہم کتاب "اسپین کی تاریخی حقیقت" ہے۔ اس کتاب کے عنوان ہی سے ان کے منصفانہ اور اعتدال پسندانہ مزاج کی تائید ہوتی ہے، اور خود کتاب بھی اس کی شاہد ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ ا

"اسپین میں سب سے پہلے وطنی شعور اندلسی مسلمانوں ہی نے بیدار کیا، اور ان ہی کی بدولت اس ملک کی انفرادی حیثیت قائم ہوئی، اور وہ دنیا کے متمدن ملکوں میں شمار کیا جانے لگا۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اسپین صرف عہد وسطی ہی میں مسلمانوں سے متاثر تھا، بلکہ اس ملک کی موجودہ تاریخ پر بھی ان کے اثرات ہیں۔"

کاسترو کے یہ تاثرات دراصل ایک معاصر مستشرق کلوڈیو سانشیز البرنس کے

جواب میں ہیں، جو ابھی تک بقید حیات ہیں، اور انھوں نے اسپین کی اسلامی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں عربوں اور مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا ہے، بلکہ ان کے آٹھ سو سالہ عہد حکمرانی کو بیک قلم مہمل اور لغو قرار دیا ہے، اور نہایت تعصب آمیز اور غیر سنجیدہ لب و لہجہ میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہسپانوی ثقافت و تمدن کی بنیاد مسلمانوں کے دور پر نہیں ہے، بلکہ اسپین کے ان رومی قبائلی باشندوں پر ہے، جو لاتینی کیتھولک مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک اور مستشرق اندلس کی اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے مستشرقین کی تعداد بہت ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اسپین کے علاوہ دوسرے ممالک کے باشندے ہیں، اس مقالے میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ مگر اس موضوع کے خاتمہ پر ایک مستشرق لیوی پروفنسال کا ذکر ناگزیر ہے۔

یہ ایک جزائری النسل یہودی تھا، مگر اس کا طریقہ بحث و تمحیص عرب کے ان اہل قلم سے ملتا جلتا ہے، جو پہلے مستشرقین کے طرز و اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں پھر خود بھی ان ہی کی طرح اسلام کشی اور مسلم معاشرہ کی تنقیص میں مصروف ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ مغربی معاشرے کی یہ چمک اصل میں مشرق ہی کی پیداوار ہے۔

پروفنسال کی زندگی کا آخری زمانہ تھا کہ ۱۹۵۶ء میں الجزائر کی مشہور جنگ شروع ہو گئی، انھوں نے اس میں مسلمانوں کی تائید کی، تاہم یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ رینہارٹ ڈوزی کے شاگرد ہیں، اور ان ہی کی روش کے پابند ہیں، بلکہ ان کی حیثیت پروفیسر ڈوزی کے ضمیمہ اور تتمہ کی ہے۔

پروفنسال نے اسپین کی اسلامی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، اور تاریخ اندلس کے کئی اہم

مراجع کی تحقیق اور اشاعت بھی ان کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے، ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔

(۱) اسلامی اسپین کی تاریخ، مطبوعہ ۱۹۵۱ء از پیرس۔ (۲) اسلامی اسپین، دسویں صدی عیسوی میں، مطبوعہ ۱۹۳۲ء از پیرس۔ (۳) جزیرہ نما ایبریہ، مطبوعہ ۱۹۳۷ء (۴) اسپین کا عربی تمدن مطبوعہ ۱۹۳۲ء از پیرس۔

انھوں نے جو ماخذ شائع کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ابن عذاری کی البیان المغرب کا تیسرا حصہ مطبوعہ ۱۹۳۰ء اس کے پہلے دو حصے پروفیسر ڈوزی نے شائع کیے تھے، لیوی پروفنسال نے انھیں دوبارہ شائع کیا۔

۲۔ الروض المعطار للحمیری، اصل متن کے ساتھ اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع کیا۔ مطبوعہ لائیڈن ۱۹۳۶ء۔

۳۔ جمہرۃ انساب العرب لابن حزم۔ ۱۹۴۸ء از قاہرہ۔ (۴)۔ اعمال الاعلام لابن الخطیب۔ ۱۹۳۴ء از رباط۔ (۵)۔ تاریخ قضاۃ الاندلس للنباہی ۱۹۴۸ء از قاہرہ۔

البتہ ماخذ کی یہ اشاعت تنہا پروفنسال کا کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کے عرب شاگردوں کا تعاون بھی شامل ہے اور وہ مخطوطات ایسے مختلف ذرائع سے حاصل کرتے تھے جو عام محققین کی دسترس سے باہر تھے۔

باشندگان اندلس کے طبقے لیوی پروفنسال نے اسلامی عہد میں اندلسی باشندوں کا جہاں ذکر کیا ہے اس سے ان کی پراگندہ خیالی کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ اس بارہ میں خود ان کے خیالات مختلف اور متضاد ہیں، چنانچہ ایک جگہ وہ انھیں چار طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں، عرب، بربر، ملک کے وہ باشندے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور وہ یہود جو مسلمان ہو گئے تھے، اپنی اس تقسیم کی تائید میں انھوں نے ایک ایسی کتاب کا حوالہ دیا ہے، جس کا مصنف نامعلوم ہے[1]۔ مگر دوسری جگہ

---

[1] (دیکھئے ص ۲۴۴)

انھوں نے کچھ اور قسمیں بتائی ہیں، جو مذکورہ طبقوں سے مختلف ہیں، یعنی وہ ہسپانوی باشندے[1] جنھوں نے عربوں سے صلح کرلی اور اسلام میں داخل ہوگئے، دوسرے وہ جنھوں نے مجبوراً اسلام قبول کرلیا، .... کہ وہ زیردست ہوگئے تھے، اور ان کی حیثیت قیدیوں سی ہوگئی تھی، اس ذلت وخواری سے چھٹکارے کا واحد راستہ یہ تھا کہ وہ اسلام قبول کرلیں، تیسری قسم انکے بعد کی وہ نسلیں ہیں، جو اندلس فتح ہوجانے کے بعد مسلمان ہوئیں، اور آخری طبقہ میں وہ عیسائی ہیں، جو جنگوں میں قید کرلیے گئے تھے، اور بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، پروفیسال نے اس تقسیم کو صحیح قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ واقعہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے،[2]

لیوی پروفنسال کا شمار مستشرقین کے اس طبقہ میں ہوتا ہے، جس نے تاریخ اندلس کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اگر انھوں نے دقت نظر، باریک بینی اور علمی دیانتداری سے کام لیا ہوتا تو ان سے یہ غلطی نہ ہوتی، کیونکہ انھوں نے پہلی تقسیم میں عیسائیوں کے اس طبقہ کو فراموش کردیا ہے، جو اپنے مذہب ہی پر باقی تھا، اور جو ملک کے باشندوں میں اکثریت میں تھا، اسی طرح انھوں نے ان یہودیوں کو بھی نظرانداز کردیا، جو اپنے دین پر قائم رہے، اندلس کے باشندوں کی تو ایک مختصر تعداد نے اسلام قبول کیا تھا، اندلس کی پوری اسلامی تاریخ میں یہ دونوں گروہ یعنی جو اسلام لاچکے تھے، یا اپنے دین پر قائم تھے، اپنے اپنے مذہب وعقیدہ

(حاشیہ صفحہ ۲۳) [1] ڈاکٹر حسین مؤنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ کتاب "ذکر مشاہیر اہل فاس فی القدیم" ہے، البتہ اسکے مؤلف کے بارے میں یہ دو نوں احتمال ہے کہ یہ یا تو ابوالولید اسماعیل بن الاحمر (متوفی ۸۰۷ھ) ہیں جنکی ایک کتاب بیوتات النسرین بھی ہے، یا یہ عبدالقادر الفاسی (متوفی ۱۰۹۱ھ) ہیں، دیکھئے فجر الاندلس حاشیہ صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴۔ [2] اسپین کی اسلامی تاریخ، صفحہ ۱۷۲، ۱۷۴۔

میں مکمل طور پر آزاد تھے، اور دونوں بلا استثناء ملک کے اعلیٰ مناصب ہی پر نہیں منصب وزارت تک پر فائز تھے،

پروفنسال نے جو دوسری تقسیم کی ہے، اور جس کو انھوں نے صحیح بھی بتلایا ہے، اس میں انھوں نے عرب اور بربر قوموں کو قطعی نظرانداز کردیا ہے، انھوں نے اندلس کے مسلمان باشندوں کو دو فرقوں میں تقسیم کردیا ہے، یعنی ایک وہ جو صلح سے اسلام میں داخل ہوئے، اور دوسرے وہ جو بجبر واکراہ داخل کئے گئے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، اسی طرح ان کا یہ الزام بھی حقیقت سے دور ہے کہ فاتح مسلمان ملکی معاملات میں ان دونوں طبقوں کے درمیان فرق وامتیاز کرتے تھے، مشہور محقق ڈاکٹر حسین مونس اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اندلس کے مسلمان یہ جانتے ہی نہ تھے کہ ان کے ملک کے کون سے حصے صلح سے حاصل ہوئے ہیں، اور کہاں کہاں جنگیں ہوئی ہیں، اس ملک کے تمام مسلمان خواہ وہ عرب فاتح رہے ہوں یا وہاں کے نومسلم سب یکساں حقوق رکھتے تھے، البتہ جنھوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا، اور اپنے دین ہی پر باقی رہ گئے تھے، وہ حکم شرعی کے مطابق ذمی قرار دیے گئے۔ چنانچہ ان پر ذمیوں کے احکام نافذ ہوتے تھے۔ مگر اس میں بھی ان کے ساتھ عدل وانصاف کا وہی معاملہ کیا جاتا تھا۔ جس کی شریعت مطہرہ نے تاکید کی ہے"[1]

لیوی پروفنسال نے اندلس کے عرب مسلمانوں پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انھوں نے

---

[1] فجر الاندلس، ص ۳۴۴، مطبوعہ قاہرہ۔

وہاں اپنے لیے عزت کی زندگی کو خاص کر لیا تھا، یہ بات نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی عربوں کے بجائے ان کے زیرنگیں اندلس کے باشندے انتہائی پرشوکت زندگی گزارتے تھے، اور یہ حقیقت آخر آخر تک قائم رہی، پروونفسال نے اگر ابن القوطیہ کی تاریخ افتتاح الاندلس کا مطالعہ کیا ہوتا تو شاید وہ ایسی غلط بات کی ترجمانی نہ کرتے، اس کتاب میں ایسے بہت سے واقعات ہیں، جو اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، مثلاً

ایک عرب سردار صمیل بن حاتم تھا، اس کا ایک واقعہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ عربی قبائل کے دس سرداروں کے ہمراہ اندلس کے ایک عجمی مالدار طباس کے پاس گیا اور سبھوں نے اس سے اپنے لیے زمینیں مانگیں۔ ارطباس نے انھیں سو سو اراضی کے قطعات دیئے، چنانچہ ہر ایک کو دس دس قطعے ملے، اسی طرح میمون بن عابد کا بھی واقعہ ہے کہ وہ ارطباس کے یہاں پہنچا، اور یہ کہکر اس سے کچھ زمین طلب کی کہ اس کی نصف پیداوار وہ ارطباس کو دیا کرے گا۔ مگر ارطباس نے بغیر کسی شرط کے اسے زمین دیدی، اور اپنے ایک منشی کو بلا کر کہا کہ اس شخص (میمون) کو وادی شوش کی پوری چراگاہ مع بکریوں، گایوں اور غلاموں کے دیدو اور قلعہ جیان بھی اس کے حوالے کردو، یہی مشہور قلعہ حزم ہے، چنانچہ میمون نے یہ تمام چیزیں لے لیں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے اندلس میں کبھی بھی عیش وعشرت کی زندگی بسر نہیں کی بلکہ وہ وہاں کے عام باشندوں کی طرح محنت، جدوجہد اور جاں فشانی کی زندگی گزارتے تھے، غالباً پروونفسال نے یہ بات اس قیاس کی بنیاد پر لکھدی ہے، کہ جس طرح مشرق کے مفتوحہ ملکوں میں عربوں کے شاندار اور پرافتخار معاشرے قائم ہو گئے تھے، ایسا ہی کچھ اندلس میں بھی ہوا ہوگا۔ مگر تاریخی حیثیت سے یہ صحیح نہیں ہے۔

[1] تاریخ افتتاح الاندلس، ابن القوطیہ۔ ص ۲۹ مطبوعہ قاہرہ۔

اس بہتان تراشی میں لیوی پروونفسال تنہا نہیں ہے، بلکہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد ان کی ہمنوا ہے، جو صرف بہتان تراشی ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اندلس کے عرب فاتحین کو غاصب اور خائن تک قرار دیتے ہیں، ان میں مستشرق ایڈیورڈ وولاس کا نجپاس اور فرانسکو سامنٹ سرفہرست ہیں۔

فتح اندلس کے باب میں پروونفسال نے ایک غلط بات یہ بھی لکھی ہے کہ عرب فاتحین اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اسلام کا دائرہ وسیع ہو کیوں کہ اس سے بیت المال کو نقصان پہونچتا تھا۔[1] جب کہ مستشرقین کی اکثریت یہ الزام عائد کرتی ہے کہ عربوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا ہے، لیکن پروونفسال کے خیال میں عرب فاتحین اسلام کے پھیلنے کو اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے ان کے خزانہ میں غیر مسلموں سے زیادہ سے زیادہ جزیہ وصول نہ ہو سکے گا۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محصل جزیہ نہیں بنا کر بھیجا تھا، بلکہ ساری دنیا کے لیے ہادی اور مرشد بنا کر آپ کو مبعوث فرمایا تھا، اور جہاں تک اسلام کے پھیلنے کا تعلق ہے وہ محض اس کے اصول وضوابط کی ہمہ گیری اور پھر لوگوں کی اثر پذیری پر منحصر ہے،

عہد مرابطین اور پروفیسر ڈوزی | اندلس کی کئی اہم اسلامی شخصیتوں پر پروفیسر ڈوزی نے کافی ناروا تنقیدیں کی ہیں، ان میں سرفہرست سلطنت مرابطین کے بانی سلطان یوسف بن تاشفین ہیں، جنھوں نے فرنگی تسلط سے اندلس کو بچایا، اور وہاں کے ملوک طوائف نے جو فتنہ و فساد بپا کر رکھا تھا، اس کا خاتمہ کیا، اور اندلس کو دوبارہ متحد و منظم کیا۔

پروفیسر ڈوزی نے براہ راست اس بلند خصال سلطان کی ہجو تو نہیں کی ہے، البتہ

[1] اسپین کی اسلامی تاریخ جلد اول۔ ص ۷۷۔

انھوں نے عبد الواحد مراکشی کی کتاب المعجب سے جابجا ایسی عبارتیں نقل کی ہیں، جو مرابطین کی بدنما تصویر پیش کرتی ہیں، یہ کتاب عبد الواحد مراکشی کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ اس میں اس کے زبانی بیانات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ اس میں مرابطین کے بارہ میں یہ درج ہے کہ

"۵۰۰ھ کے اواخر میں امیر المسلمین کا اقتدار بھی کافی کمزور ہوگیا، جس کے نتیجہ میں بدامنی کی ابتدا ہوگئی، وجہ یہ تھی کہ مرابطین کے بڑے بڑے سردار ملک کے اکثر حصوں پر قابض ہوگئے، اور انھوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، نیز عورتیں بااختیار ہونے لگیں اور معاملات کا تعلق انہی سے ہوگیا، ان حالات کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے امیر المومنین کا اقتدار دن بدن کمزور ہوتا گیا، اور وہ صرف نام ہی کے امیر رہ گئے، البتہ خراج کی کچھ رقمیں ان کو مل جاتیں وہ اسی پر اکتفا کر لیتے اور اپنا وقت عبادت الٰہی میں گزار دیتے۔ اس کی وجہ سے ملک کے بیشتر حصوں کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ تقریباً پہلے جیسے حالات پیدا ہوگئے۔

عبد الواحد مراکشی کی یہ باتیں سلطان علی بن یوسف بن تاشفین کے بارہ میں کہی گئی ہیں، پروفیسر ڈوزی نے ان عبارتوں کو بار بار نقل کیا ہے، اور انھیں کافی مبالغہ سے پیش کیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مرابطین کا پورا دور بربریت اور پسماندگی کا دور تھا۔

(باقی)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور فن تفسیر

از

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

یہ مقالہ "الجامعۃ السلفیہ" بنارس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر منعقد ہونے والے سیمینار میں ۲۲ نومبر ۱۹۸۷ء کو پڑھا گیا۔ (معارف)

نبی اکرم علیہ افضل التحیات والصلوات نے ارشاد فرمایا ہے:

مثل أمتي مثل المطر[1] لا يدرى أوله خير أم آخره ...

میری امت کی مثال (نفع رسانی میں) بارش جیسی ہے، جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ بہتر ہے یا آخری

---

[1] رواہ الترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ ۲/۵۸۳، باب ثواب ہذہ الامۃ۔ وفی المرقاۃ لملا علی قاری فی شرح ہذا الحدیث قال (الترمذی) ہذا حدیث حسن غریب ورواہ احمد عن عمار بن یاسر وابن حبان فی صحیحہ عن سلمان .... قال بعض المحققین حدیث مثل امتی حدیث حسن لہ طرق قد یرتقی بہا الی الصحۃ، ونقل القاری عن بعض الشراح لا یحمل ہذا الحدیث علی التردد فی افضل الاول علی الآخر، فان القرن الاول ہم المفضلون علی سائر القرون من غیر شبہۃ .... وانما المراد بہ نفعہم فی بث الشریعۃ والذب عن الحقیقۃ (مرقاۃ ص ۶۶۴/۱۱، مکتبہ امدادیہ ملتان) عصر حاضر کے مشہور صاحب نظر عالم شیخ البانی نے بھی اپنے حاشیۂ مشکوٰۃ میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے (وھو صحیح لطرقہ) المشکوٰۃ، ج ۳ ص ۲۹۳، مطبوعہ المکتب الاسلامی دمشق۔

امت مرحومہ کی پوری تاریخ اس فرمان نبویؐ کی صداقت پر گواہ ہے، "تاریخ رجال" پر جس کی ادنیٰ بھی نظر ہے اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ تقریبًا ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ کے اندر ایسے افراد پیدا کیے ہیں جن سے بڑا فیض پہونچا، اصحاب دعوت وعزیمت کے تذکروں پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہمارے عصر کی یا قریبی زمانہ کی فلاں شخصیت سے اللہ تعالیٰ نے جو مسبب الاسباب ہے عقائد، عبادات، معاملات، تہذیب ومعاشرت اور تعلیم وتربیت کے بارے میں امت کی خیرخواہی اور اصلاح کا جو کام جس پیمانہ پر لیا ہے اور جس درجہ اس کے گہرے اثرات مترتب ہوئے ہیں، وہ کیا اس سے پہلے خیرالقرون کے بعد کسی اور شخص اور جماعت سے لیا تھا یا نہیں؟ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت جس کے مختلف النوع کارناموں اور ہمہ گیر اثرات کی بنا پر اسے بہت سے متقدمین پر بھی عظمت وبرتری حاصل ہے، شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانیؒ کی بھی ہے، اگر ان کے تمام کارناموں سے قطع نظر صرف بعض کارناموں ہی پر نظر ڈالی جائے تو اس کے لیے بھی دفتر درکار ہوگا، اس لیے راقم کے لیے یہ بھی فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ شیخ کی زندگی کے کس پہلو پر گفتگو کرے اور کسے چھوڑے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بہت غور وتامل کے بعد راقم نے "ابن تیمیہ اور تفسیر" کا موضوع منتخب کیا جو اس کے ذوق سے بھی مناسب ہے، اور صاحب تذکرہ کے علمی مرتبہ کے اعتبار سے بھی موزوں ہے، لیکن ایک مقالہ میں اس موضوع کا حق ادا ہونا مشکل ہے۔

مختلف علوم کا تجزیہ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی شاید بے محل نہ ہو کہ علوم دینیہ اور فنون عالیہ میں غالبًا تفسیر ہی ایک ایسا فن ہے جس کے بارے میں اہل نظر کا اندازہ ہے کہ وہ ابھی تک تشنہ وخام ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری (م ۹۷۰ھ) کی کتاب کے حوالہ سے علاء الدین حصکفی (م ۱۰۸۸ھ) نے

بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو:

العلوم ثلاثۃ، علم نضج وما احترق وھو علم النحو والاصول وعلم لا نضج ولا احترق وھو علم البیان والتفسیر وعلم نضج واحترق وھو علم الحدیث و الفقہ۔	علوم کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جو پختہ ہوگیا ہے، لیکن ضرورت سے زیادہ نہیں یہ علم نحو واصول ہے، دوسری وہ جو نہ ابھی پختہ ہوا نہ اس پر زیادہ محنت ہوئی ہے، یہ علم بیان وتفسیر ہے، اور ایک وہ ہے جو نہ صرف پختہ ہوگیا ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ اس پر کام ہوچکا ہے وہ علم حدیث وعلم الفقہ ہے۔

...

یہ بیان نہایت بلیغ اور جامع ہے جس میں فن تفسیر کے علاوہ دیگر علوم کا بھی جچا تلا جائزہ لیا گیا ہے اور جس نے مختلف علوم وفنون بالخصوص فن تفسیر وحدیث کا گہرا اور تقابلی مطالعہ کیا ہے اسکے لیے اس تجزیہ کا مبنی برحقیقت ہونا محتاج دلیل نہیں۔

شیخ کا فن تفسیر میں درجہ اس پس منظر میں شیخ الاسلامؒ کی فن تفسیر سے متعلق خدمات کی اہمیت کتنی بڑھ جاتی ہے، اس کا اندازہ کرلینا کسی صاحب فن کے لیے مشکل نہیں، مگر چونکہ عام طور پر شیخ الاسلام کی شہرت ایک محدث ومتکلم یا مناظر ومصلح کی حیثیت سے زیادہ ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ فن تفسیر میں انکے بلند درجہ ومرتبہ کے بارے میں کچھ لوگوں کو تعجب ہو، لیکن علامہ کے علمی کارناموں کی فہرست ہی پر ایک نظر ڈالنے سے اس کے باوزن ہونے کا پتہ چل سکتا ہے، ان کے علوم کی دائرۃ المعارف جو مجموعۂ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے نام سے شائع ہوئی ہے کہ جس میں پوری چار پانچ ضخیم جلدیں (تیرہ

لہ الدر المختار مع الرد المحتار ۱/۳۱ (مکتبہ نعمانیہ دیوبند)

تا ۴۲ تک)، صرف فن تفسیر کے مباحث پر مشتمل ہیں، تیرہویں جلد اصولی مباحث کے لیے مخصوص ہے، اس سے پہلے بھی قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے علامہ کے متعدد تفسیری مجموعے شائع ہوچکے ہیں؛ علاوہ ازیں تقریباً سب معتبر تذکرہ نگاروں نے فن تفسیر میں بھی ان کے اختصاص و امتیاز کا ذکر کیا ہے؛ ان میں علامہ کے جلیل القدر معاصر تذکرہ نگار بھی شامل ہیں، مثلاً امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

کان آیة فی الذکاء ..... و	وہ ذہانت میں بہت ممتاز تھے ... اور علم
تقدم فی علم التفسیر....	تفسیر میں (بھی) بہت آگے تھے ...
(وقد لقبہ مع بعض	بعض دوسرے علماء کی طرح انھیں
العلماء الآخرین بحبر	بھی ماہر قرآن کا لقب دیا گیا تھا،
القرآن) وقال: واما التفسیر	تفسیر میں ان کی حیثیت مسلّم تھی،
فمسلم الیہ ولہ فی استحضار	انھیں آیات قرآنی سے استدلال
الآیات من القرآن وقت اقامة	میں عجیب قدرت حاصل تھی، تفسیر
الدلیل بہا علی المسئلة قوة عجیبة...	میں اسی امتیاز کی وجہ سے انھوں نے
ولفرط امامتہ فی التفسیر وعظمة	بہت سے مفسرین کی غلطیاں
اطلاعہ بین خطأ کثیر من اقوال	واضح کی ہیں.
المفسرین ویوھی اقوالاً عدیدة[1]	...

عصر حاضر کے مشہور بالغ نظر مصنف اور ایمۂ اسلام کے افکار و سوانح کے خاص شارح شیخ ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب (ابن تیمیہؒ حیاتہ وعصرہ) میں لکھا ہے:

لقد کان المورخون ناقلین	مورخین نے امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں کے

[1] بحوالہ پیش لفظ بر مقدمة فی اصول التفسیر ص ۹۰۸ (للدکتور عدنان زرزور)

عن تلامیذہ أنہ جمع قدراً کبیراً	حوالہ سے لکھا ہے کہ موصوف نے قرآن مجید
فی تفسیر القرآن الکریم وقالوا انہ	کی تفسیر میں اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے جو
یقع فی اکثر من ثلاثین مجلداً[1]	تیس (۳۰) جلدوں سے زیادہ میں سمائے گا،

طلب علم میں محنت | علامہ کے اس موضوع سے تعلق و انہماک بلکہ اس میں فنائیت کا پتہ خود ان کے اس بیان سے بھی چلتا ہے:

ربما طالعت علی الآیة الواحدة	مجھے کبھی کبھی ایک آیت کی تفسیر کیلیے
نحو مأة تفسیر۔	سو تفسیریں دیکھنا پڑیں.

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ مطالعہ میں اس قدر شدید ریاضت و مشقت اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنتوں کے مکمل اور صحیح استعمال پر اعتماد کرنے کے بجائے اللہ علیم و خبیر اور معطی و وہاب کی بارگاہ میں فہم صحیح کے لیے یوں دعا کرتے: یا معلم آدم و ابراہیم علمنی! اور اس پر بس نہیں کرتے بلکہ ایسی موثر و قوی دعا کے ساتھ ہی عبدیت اور نیازمندی کا جو عملی انداز اختیار کرتے تھے وہ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ ہے، اسے ان ہی کے الفاظ میں سنیے:

وکنت أذھب إلی المساجد	میں ویران اور غیر آباد مسجدوں میں جاکر
المھجورة ونحوھا وأمرغ وجھی	اپنی پیشانی مٹی میں رگڑتا اور اللہ تعالیٰ سے
فی التراب وأسأل اللہ تعالیٰ و	دعا کرتا اور کہتا کہ اے ابراہیم کے معلم!
أقول یا معلم ابراھیم فھمنی[2]	مجھے بھی فہم سلیم کی دولت عطا فرما!

ایسی عبدیت کے اظہار اور انابت کے بعد کریم آقا کی طرف سے بندہ نوازی کیوں نہ ہوتی،

بچپن کا غیر معمولی واقعہ | اس سلسلہ میں وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس کو علامہ کے ایک شاگرد اور

[1] ابن تیمیة حیاتہ وعصرہ، ص ۵۱۰ مطبوعہ دار الفکر العربی، [2] ایضاً ص ۵۱۱۔

قدیم ترین معاصر تذکرہ نویس حافظ عمر بن علی البزار المتوفی ۷۴۹ھ نے بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ شیخ الاسلامؒ کے بالکل بچپن اور ابتدائی تعلیم کے زمانہ کا ہے، اس سے ان کی افتادِ طبع کو سمجھنے اور بعد کی ترقیوں اور کمالات کے راز کی پردہ کشائی میں مدد ملتی ہے، جسے انھوں نے شیخ الاسلامؒ کے ایک ابتدائی استاذ (حفظ قرآن کے استاذ) کے حوالہ سے نقل کیا ہے، یہاں اسے مصنف کے الفاظ میں ہی پیش کیا جارہا ہے:

قال لی أبوہ وھو صبیؒ (أی شیخ	مجھ سے ابن تیمیہؒ کے والد نے کہا کہ میں
الإسلام) أحب إلیك أن توصیہ	چاہتا ہوں آپ ابن تیمیہؒ کو نصیحت کریں
وتعدہ بأنك إن لم تنقطع عن	اور یہ لالچ دیں کہ اگر تم نے پڑھنے میں ناغہ
القراءۃ والتلقین أدفع إلیك کل	نہیں کیا تو ہر مہینہ تمھیں چالیس درہم
شھر أربعین درھمًا، قال ودفع إلیّ	دوں گا، یہ کہہ کر انھوں نے مجھے چالیس
اربعین درھمًا وقال أعطہ إیاھا،	درہم دیے اور فرمایا کہ یہ انھیں دیدیجیے،
فإنہ صغیر وربما یفرح فیزداد	کیونکہ وہ چھوٹا ہے اس سے خوش ہوگا اور
حرصہ فی الإشتغال بحفظہ القرآن	قرآن مجید کے حفظ میں زیادہ دلچسپی دکھائے گا،
ودرسہ وقل لہ للّٰہ فی کل شھر	اور اس سے کہیے کہ ہر مہینہ یہ رقم ملا کرے گی'
مثلھا فامتنع من قبولھا وقال	لیکن جب استاد نے رقم دی تو انھوں نے اسے
یاسیدی إنی عاھدت اللہ تعالیٰ	لینے سے انکار کیا اور کہا جناب میں نے اللہ تعالیٰ
ان لا أخذ علی القرآن اجرًا،	سے یہ عہد کیا ہے کہ قرآن مجید کا کوئی معاوضہ
ولم یاخذھا[1]	نہیں لوں گا۔

[1] الاعلام العلیہ فی مناقب ابن تیمیہ ص ۵۴، تالیف الحافظ عمر بن علی البزار، طبعۃ ثانیۃ (المکتب الاسلامی بیروت)

اس واقعہ سے جہاں شیخ کے والد ماجد کے حسن تربیت اور جذبۂ تحریص علم کا پتہ چلتا ہے وہیں شیخ کی عقل سلیم اور طبع مستقیم کا اندازہ بھی ہوتا ہے، یقیناً اس وقت کے اہل بصیرت شیخ سعدی کی زبان میں پکار اٹھے ہوں گے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

اور بعد کے واقعات سے یہ پیشین گوئی حرف بحرف بلکہ توقع سے کہیں بڑھ کر صحیح اور سچی ثابت ہوئی، یہ تو ضمناً ایک سبق آموز واقعہ کا ذکر آگیا تھا، اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، علامہؒ نے پورے قرآن مجید کی تفسیر اگرچہ مصلحتہً نہیں لکھی لیکن جتنا کچھ ذخیرہ محفوظ رہ گیا ہے وہ بھی اس فن میں ان کے صحیح درجہ و مرتبہ کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

شیخ کا طرز تفسیر کیا تھا؟ شیخ کی مجلس درس کے ایک شریک و مستفید حافظ عمر بن علی البزار اپنا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

ولقد کان إذا قرئ فی مجلسہ	شیخ کی مجلس میں قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتیں
اٰیات من القراٰن العظیم یشرع	اور وہ اس کی تشریح و تفسیر شروع کر دیتے
فی تفسیرھا فینقضی المجلس	اور پوری مجلس ختم ہوجاتی مگر درس کمل نہ ہوتا،
بجملتہ والدرس برمتہ وھی	بلکہ ایک آیت کی بھی پوری تفسیر نہ ہوپاتی،
فی تفسیر بعض اٰیۃ منھا	شیخ یہ سب کچھ زبانی اور فی البدیہہ کہتے تھے'
یفعل ذلك بدیھۃ .... وکان	اور جب درس ختم ہوتا تھا تو اکثر سامعین کا
غالبًا لا یقطع الا ویفھم السامعون	اندازہ ہوتا کہ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو
انہ لولا مضی الزمن المعتاد	وہ ابھی بہت کچھ فرماتے اور تفسیر فرماتے رہتے
لأورد اشیاء اخریٰ فی معنی ما	.... شیخ نے صرف "قل ھو اللہ احد" کی

هو فيه من التفسير.... ولقد املى فى تفسير "قل هو الله احد" مجلدا كبيرا وقوله تعالى: "الرحمن على العرش استوى" نحو خمس وثلاثين كراسة[1]

... تفسیر ایک بڑی جلد کے بقدر املا کرائی اور "الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" پر تقریباً پینتیس ۳۵ کاپیاں لکھائیں۔

اس کے بعد عمر بن علی بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر وہ تفسیر مکمل ہو جاتی جو شیخ نے شروع کی تھی تو پچاس ۵۰ جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہونچتی۔

تفسیر میں شیخ کی انفرادیت | علامہ ابن تیمیہؒ کے تفسیری افادات کس قسم کے ہوتے تھے؟ اس کیلیے ہم شیخ ابوزہرہ کا نہایت مختصر مگر جامع قول نقل کرتے ہیں، اس سے ان کے انداز تفسیر کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

فان الذى أثر عنه نماذج جيدة للتفسير السلفى قد اختلط بعمق النظر وسلامة الذوق من غير ان يطغى النظر على الاثر[2]

علامہ ابن تیمیہؒ کی تفسیر کا جو حصہ نقل ہوا ہے وہ سلف (صحابہ و تابعین) کی تفسیر کا عمدہ نمونہ ہے لیکن اسی کے ساتھ اس میں علامہ کا ذوق سلیم اور دقت نظر بھی صاف نمایاں جھلکتا ہے مگر موصوف کا نقطۂ نظر صحابہ و تابعین سے منقول اقوال پر غالب نہیں ہو پایا ہے۔

---

[1] الاعلام العلیۃ فی مناقب ابن تیمیۃ ص ۲۰، ۲۱ تالیف الحافظ عمر بن علی البزار، طبعۃ ثانیۃ، (المکتب الاسلامی بیروت) [2] "ابن تیمیۃ" لأبی زہرہ ص ۵۱۰۔

اس اجمال کی تفصیل کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مظلہٗ کی شہرۂ آفاق کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کی دوسری جلد جو تمامتر علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ پر ہے، کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے،

چند خصوصیات | ان کے طریقۂ تفسیر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے ربط ہے، فاضل مصنف آیات الٰہی کو اپنے گرد و پیش کی زندگی اور اپنے معاصر انسانوں پر منطبق کرتا ہے، اور ان آیات کے نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے، اور اپنے ہم عصروں اور امت کے مختلف طبقوں کا احتساب کرتا ہے، وہ بتلاتا ہے کہ ان آیات و حقائق سے زندگی میں کہاں کہاں انحراف ہو رہا ہے، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں[1]

مولانا نے شیخ الاسلامؒ کے طرز تصنیف کے متعلق اور بھی بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں مثلاً

"وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس پر اتنا مواد اور مسالہ جمع کر دیتے ہیں جو بیسیوں کتابوں اور سینکڑوں صفحات میں منتشر ہوتا ہے.... اکثر اس مواد اور نقول کے پیش کرنے میں بحث کا سرا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور مطالعہ کرنے والا نقول کی کثرت میں گم ہو جاتا ہے"

مولانا اس طرز تحریر کا ایک خاص فائدہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

"یہ ان کا بڑا علمی احسان ہے کہ انھوں نے بہت سا قدیم مواد و مسالہ محفوظ کر دیا، اور بہت سے افکار و آراء کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا[2]"

شیخ کے اس طرز کلام کو "بات سے بات نکالنے" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، جو غیر معمولی ذہانت اور قوت ادراک کی علامت ہے، یہاں اس کی صرف ایک مثال ان کے تفسیری ذخیرہ

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت ص ۱۴۵، حصۂ دوم (بار پنجم، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ) [2] ایضاً۔

سورۂ اخلاص کی تفسیر سے پیش کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ کی تشریح بتفسیر میں "نفی مثل" کے مصداق کی تعیین کرتے ہوئے علامہ کے زرنگار اور سیال قلم نے کتنے مباحث سمیٹ لیے ہیں، اور کن کن مخفی اور دور دراز گوشوں کو روشن کر دیا ہے اس کا اندازہ سطور ذیل سے ہوگا:

لما حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج
استلم الرکنین ولم یستلم الشامیین	کیا تو کعبۃ اللہ کے صرف دو رکنوں، یمانی
لانہما لم یبنیا علی قواعد	اور حجر اسود کا استلام کیا تھا، بقیہ دو رکنوں کا
ابراھیم ..... فدل ذلک	نہیں کیا، کیونکہ وہ ابراہیمی بنیادوں پر نہیں
علی ان التمسح بحیطان	تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کعبہ کی دیوار و رکا
الکعبۃ غیر الرکنین الیمانیین	یا رکنین کے علاوہ کسی اور حصہ کا چومنا سنت
وتقبل شیئ منہا غیر الحجر	نہیں ہے، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ
الأسود لیس لبینۃ..... فمعلوم	کعبہ کے مقابلہ میں دوسری مسجدوں کا احترام
أن جمیع المساجد حرمتہا	کم ہے، اور مقام ابراہیم (جو کعبہ کے پاس ہے)
دون الکعبۃ وان مقام إبراھیم	کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف
بالشام وغیرھا وسائر مقامات	منسوب دیگر مقامات جو شام وغیرہ میں ہیں
الانبیاء دون المقام الذی قال	اس مقام سے کمتر ہیں جن کے بارے میں
اللہ تعالیٰ فیہ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاتَّخِذُوا مِن
إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى فعلم ان سائر	مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى، تو اس سے یہ
المقامات لا تقصد للصلاۃ	ثابت ہوا کہ دوسرے مقام کی زیارت کیلیے

فیہا کالحج إلی سائر	یا وہاں نماز پڑھنے کے لیے نہیں جانا چاہیے
المساجد ولا یتمسح بہا ولا	اور نہ انھیں چھو کر یا بوسہ دے کر تبرک
یقبل شیئ من مقامات	حاصل کرنا درست ہے، اور نہ کسی دوسرے
الانبیاء ولا یقبل وجہ	نبی کی طرف منسوب مقامات کو بوسہ دینا چاہیے
الأرض إلا الحجر الأسود [1]	اور نہ کسی جگہ کی زمین کو بوسہ دیا جائے
...	سوائے حجر اسود کے.

مکہ کی سرزمین کا حکم اس کے بعد یہاں پر کفار کے شعار کی بحث بھی بہت تفصیل کے ساتھ تحریر کی ہے، اور پھر اسی ذیل میں ارض خراجی کا حکم اور اس کے بارے میں فقہائے امت کے اقوال نیز دوسری اراضی کا حکم خصوصًا ان علاقوں کا حکم جن کو مسلمانوں نے کافروں سے جنگ کرنے کے بعد حاصل کیا ہو بیان کیا ہے، پھر مکہ معظمہ کی اراضی اور وہاں کی عمارات کے احکام شرعیہ سے حسب عادت نہایت شرح و بسط کے ساتھ تعرض کیا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی سورۃ الحج کی آیت إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ سے اس طرح استشہاد کیا ہے:

وھذہ ای العلۃ التی اختصت	یہ سبب صرف مکہ کے ساتھ مخصوص ہے،
بہا مکۃ دون سائر الامصار	کسی اور جگہ کے لیے نہیں ہے، کیونکہ اللہ
فان اللہ اوجب حجہا علی جمیع	تعالیٰ نے صرف مکہ ہی کا حج اور عمرہ ہمیشہ
الناس وشرع اعتمارہا دائمًا	کے لیے واجب و مشروع کیا ہے، لہٰذا یہ
فجعلہا مشترکۃ بین جمیع عبادہ	مقام مکہ اللہ کے تمام بندوں کے لیے مشترک

[1] تفسیر سورۂ اخلاص ص ۱۲۷ (الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۲۳ھ بالمطبعۃ الحسینیہ، مصر)

کما قال "سواء العاکف فیه و الباد" ولهذا کانت منی وغیرها من المشاعر من سبق الی مکان فهو احق به حتی ینتقل عنه کالمساجد، ومکة نفسها من سبق الی مکان فهو احق به والانسان احق بمساکنه مادام محتاجاً الیها و ما استغنی عنه من المنافع فعلیه بذله بلا عوض لغیره من الحجیج وغیرهم ولهذا کانت فی اجارة دورها وبیع رباعها . . . . ولا یجوز اجارتها وعلی هذا ستدل الأثار المنقولة فی ذلك عن النبی صلی الله علیه وسلم وعن

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "برابر ہے وہاں مقیم اور باہر کا" اور اسی بنا پر منیٰ وغیرہ دیگر مشاعر کے بارے میں یہ حکم شرعی ہے کہ جو جس جگہ پہلے پہونچ جائے اس کا مستحق وہی ہے جب تک کہ وہ منتقل نہ ہو جائے جیسا کہ عام مسجدوں کا حکم ہے اسی طرح مکہ میں جس جگہ جو شخص پہلے پہونچے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، وہاں سے انسان اپنی جائے رہائش کا جب تک ضرورت مند ہے زیادہ حقدار ہے اور جب اس سے مستغنی ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کا حجاج وغیرہ کو بلا عوض موقع دے، اس لیے مکہ کے مکانات بیچنے اور انھیں کرایہ پر اٹھانے کے بارہ میں علماء کے تین قول ہیں، (۱) دونوں ناجائز ہیں، (۲) دونوں جائز ہیں (۳) صحیح قول یہ ہے کہ بیچنا تو جائز ہے مگر کرایہ پر دینا جائز نہیں، یہی بات احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے

الصحابة رضی الله عنهم [1]

اقوال سے ثابت ہوتی ہے [2]

اس کے بعد پھر اصل موضوع توحید اور نفی شرک سے متعلق بعض اصولی امور مثلاً "مشاہد" اور ان کی تعظیم کی حیثیت بیان کر کے نیز بنائے مساجد اور عمارۃ مساجد کے مابین فرق بتا کر ان کے

---

[1] تفسیر سورۂ اخلاص ص ۱۳۴ (الطبعة الاولیٰ ۱۳۲۳ھ بالمطبعة الحسینیة، مصر) [2] یہاں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی جو تحقیق کہ معظمہ کی سرزمین اور مکانات کو کرایہ پر اٹھانے کے عدم جواز کی بابت نقل ہوئی ہے اس میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ یہی مسلک امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ اور بہت سے اکابر و ممتاز فقہاء و علماء کا بھی ہے، نیز امام احمدؒ بن حنبل کا رجحان بھی اسی طرف ہے، جیسا کہ مشہور حنبلی محقق عالم ابن قدامہؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتابوں المغنی و الشرح الکبیر میں نقل کیا ہے، اور اس بارے میں متعدد احادیث و آثار بھی ذکر کیے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے المغنی مع الشرح الکبیر ص ۲۰-۲۱ ج ۴، المغنی ج ۴ ص ۳۰۴-۳۰۵ (مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۳۹۲ھ)، نیز فقہ حنفی کی مشہور و معتبر ترین کتاب "ہدایہ اخیرین" ج ۴ ص ۴۵۵ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک (کرایہ کا عدم جواز) نقل کیا گیا ہے، البتہ وہاں کے مکانات کی بیع کے بارے میں امام صاحب سے ان کے شاگردوں امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کا اختلاف نقل کیا گیا ہے، لیکن کرایہ کے بارے میں نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سب متفق ہیں، امام ابن تیمیہؒ سمیت جمہور فقہائے امت کہ جن میں ائمہ اربعہ میں سے تین، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ و امام احمد بن حنبلؒ شامل ہیں اگر ان کے قول کے مطابق سرزمین مکہ معظمہ کے معاملہ میں عمل کیا جاتا تو یہ بہت اچھا ہوتا اور اس سے حجاج کو بڑی سہولت و راحت ملتی، کیونکہ اس سے ان کے اخراجات میں غیر معمولی کمی ہو جاتی۔ عجیب بات ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں باہر کے حجاج کو نہ صرف قیام کی سہولتیں مفت حاصل ہوتی تھیں بلکہ ان کے کھانے پینے کا نظم بھی مفت کیا جاتا تھا، اور اس کے لیے مکہ معظمہ میں باقاعدہ دو عہدے رفادہ اور سقایہ قائم تھے۔

احکام بیان کیے ہیں، لکھا ہے:

عمارتها بالعبادة فيها كالصلاة ..... واما نفس البناء فيجوزان يبنيها البر والفاجر والمسلم والكافر۔

عمارت نام ہے مسجدوں کو عبادت سے آباد کرنے کا، مثلاً نماز سے، یہ صرف مسلمان ہی کا کام ہے، رہی ظاہری تعمیر تو وہ نیک و بد، مسلم و کافر، سب کر سکتے ہیں۔

اکثر مزارات جعلی ہیں اسی ذیل میں عظمت مشاہد وقبور وغیرہ کے ضمن میں بعض ایسے دلچسپ تاریخی حقائق اور فکر انگیز باتیں شیخ نے ارقام فرمائی ہیں جن پر نہ جانے کتنے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے کہ عوام تو عوام اکثر خواص بھی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے، ان عجیب انکشافات اور علمی نکتوں کو ملاحظہ فرمائیے:

اهل المشاهد كثير من مشاهدهم او اكثرها كذب، فان الشرك مقرون بالكذب في كتاب الله كثيرا، قال الله تعالى وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ،

اکثر مقبرے غلط اور جھوٹے طور پر بزرگوں کی جانب منسوب ہیں اور جھوٹ شرک کے ساتھ لازم وملزوم کی سی حیثیت رکھتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ شرک کے ساتھ زور (غلط بیانی) کا ذکر کیا ہے مثلاً وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ الخ

پھر امام صاحب نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں:

وذلك كالمشهد الذي بني بالقاهرة على رأس الحسين

قاہرہ میں امام حسینؓ کے سر کا جو مقبرہ بتایا جاتا ہے اس کی نسبت غلط ہے،

وهو كذب باتفاق اهل العلم .... وكذلك مشهد علي رضي الله عنه .... انما هو قبر المغيرة بن شعبة رضي الله عنه وعلي رضي الله عنه انما دفن في قصر الامارة بالكوفة ودفن معاوية بقصر الامارة بدمشق ودفن عمرو بن العاص بقصر الامارة بمصر خوفا عليهم اذا دفنوا في المقابر البارزة ان ينبشهم الخوارج المارقون فان الخوارج تعاهدوا على قتل الثلاثة[1] ...

اور اس پر اہل علم کا اتفاق ہے، اسی طرح حضرت علیؓ کا جو مقبرہ بتایا جاتا ہے وہ بھی غلط ہے، بلکہ وہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا مزار ہے، کیونکہ حضرت علیؓ تو کوفہ کے قصر امارت میں مدفون ہیں اور حضرت معاویہؓ دمشق کے اور حضرت عمروؓ بن العاص مصر کے قصر میں، کیونکہ خوارج کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ وہ کہیں ان حضرات کے جسموں کو قبر سے نکال کر ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

ان علمی انکشافات کی اہمیت وافادیت سے کون صاحب نظر انکار کر سکتا ہے، لیکن ہمارا مقصد لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ہے کہ وہ سوچیں کہ کیا کسی بڑے سے بڑے ذہین وطباع شخص کا طائر فکر یہاں تک پرواز کر سکتا ہے کہ وہ لم یکن لہ کفوا احد کی تفسیر کے تحت ایسی ایسی عجیب نکتہ آفرینیاں اور مناسبتیں تلاش کرے جن میں مکہ معظمہ کی سرزمین کے احکام سے لے کر مشاہد کے جعلی ہونے تک نیز ممتاز صحابۂ کرامؓ کے مقام دفن کا سراغ بھی مل جائے۔

[1] تفسیر سورۂ اخلاص ص ۱۳۸-۱۳۹ (الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۲۳ھ بالمطبعۃ الحسینیہ، مصر)

کلامی مباحث

علامہ کی تفسیر میں اکثر کلامی مباحث بھی زیر بحث آئے ہیں اور انھوں نے ان کے بارے میں اپنی فیصلہ کن رائے مدلل طریقہ پر پیش کی ہے، اس طرح کے مسائل میں مسئلۂ صفات سب سے زیادہ اہم اور معرکۃ الآراء ہے، اس میں اہل حق واہل باطل (اہل سنت واہل بدعت) کے درمیان ہی نہیں خود اہل حق (اہل سنت) کے مابین بھی اختلافات چلے آرہے ہیں، خاص طور پر متقدمین ومتاخرین اہل سنت کا اختلاف تاویل اور عدم تاویل کی بابت تو بہت مشہور ہے جس سے علم عقائد کا معمولی طالب علم بھی ناواقف نہ ہوگا، چونکہ اب یہ بات غالباً سب یا اکثر اہل علم کے دائرۂ علم میں آچکی ہے کہ شیخ الاسلام کا مسلک صفات باری تعالیٰ کے سلسلہ میں متقدمین کی طرح عدم تاویل کا ہے، اس لیے اس کے بارہ میں ان کی عبارتیں اور نقول پیش کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اسی سلسلہ کی ایک کڑی آیات متشابہات کی تاویل سے راسخین فی العلم کی باخبری اور بےخبری کے بارے میں علماء کا اختلاف بھی ہے، جو دراصل سورۂ آل عمران کی مشہور آیت وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ پر وقف وعدم وقف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ شیخ اور ان کے علاوہ عام طور پر مفسرین نے اس کو بیان کیا ہے (مثلاً دیکھیے تفسیر کشاف آیت محولۂ بالا) یہاں یہ بتانا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ شیخ پہلے زمرہ میں ہیں، جو آیات متشابہات کی تاویل کے علم کو ممکن بتاتا ہے اور اس کے لیے دلائل پیش کرتا ہے، یہ بحث بہت طویل ہے، اختصار کے پیش نظر اس کو قلم انداز کیا جارہا ہے، تفصیل کے لیے مجموعۂ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تیرھویں جلد دیکھنی چاہیے[1]۔ اس وقت ان مباحث میں محاکمہ کرکے کسی پہلو کو ترجیح دینا ہمارا مقصد ومنصب نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ علامہ کا شہوار قلم کس کس شاہراہ پر دوڑا ہے، اور اس نے کیسے کیسے معرکے سر کیے ہیں۔

۱؎ از ص ۲۷۳ (طبعۂ اولیٰ کا عکس)

علامہ ابن تیمیہؒ کا مہتم بالشان علمی شاہکار مقدمۂ تفسیر

ان معروضات سے شیخ الاسلامؒ کی فن تفسیر میں مہارت وحذاقت، وسعت نظر، قوت استنباط اور ان کی اخاذ طبیعت کا کسی حد تک اندازہ ہوا ہوگا، لیکن راقم کے خیال میں تفسیر کے باب میں ان کا سب سے اہم، قابل قدر اور شاہکار کہے جانے کے لائق کارنامہ وہ رسالہ ہے جو مقدمۃ فی اصول التفسیر کے نام سے متعدد بار چھپ چکا ہے اور چند اوراق پر مشتمل ہے، یہ کتابچہ دراصل "بقامت کہتر بقیمت بہتر" اور "دریا بکوزہ" کا صحیح مصداق ہے، علوم قرآن کے اصول پر اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی اہم تصنیف ہے جس کی مثال تفسیر کے وسیع ذخیرہ میں نہیں ملتی، بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ اس سے پہلے اصول تفسیر میں ایسی وقیع، مختصر اور جامع تحریر پورے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی، اسکے بعد گو بہت سی اہم اور قابل قدر مختصر ومفصل تصنیفات وجود میں آئیں مگر ان میں اسی مقدمہ سے استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً امام بدرالدین محمد زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی "البرہان"، جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی "الاتقان" اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کی "الفوز الکبیر"، موخرالذکر کتاب کے بعض مباحث مثلاً شان نزول کی بحث تو اسی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، اس رسالہ کو اپنے موضوع ہی میں نہیں خود شیخ الاسلامؒ کی تصانیف میں بھی کئی حیثیتوں سے بڑا امتیاز حاصل ہے، ایک خاص بات اس کے اسلوب کا امتیاز بھی ہے، شیخؒ کی دوسری تصانیف کے برخلاف اس میں نہایت مربوط ومنضبط طریقہ پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کے مباحث میں کوئی انتشار اور کسی طرح کی بے ربطی نہیں پائی جاتی، اسی کے ساتھ عام اصولی کتابوں کے طرز وادا کے مطابق اس میں بھی اختصار اور بقدر ضرورت کلام پر اکتفا کیا گیا ہے اور یہ حشو وزوائد سے پاک ہے، رسالہ کی ان خصوصیات وامتیازات کا تقاضا تھا کہ اس پر اس مقالہ میں تفصیل سے گفتگو کی جاتی اور اس کے مفید پہلوؤں کو نمایاں کرکے قارئین کی

علی ضیانت کا سامان مہیا کیا جاتا، مگر طوالت کے خوف سے یہاں رسالہ کے چند اہم مندرجات کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے۔

شیخؒ نے یہ رسالہ اپنے بعض شاگردوں کی فرمائش پر لکھا ہے، جیسا کہ ابتداء میں خود صراحت بھی کی ہے، اس سے رسالہ کے اغراض و مقاصد بھی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے ہم ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

فقد سألنی بعض الاخوان	مجھ سے میرے بعض بھائیوں نے
ان اکتب له مقدمة	درخواست کی کہ میں ایک ایسا
تتضمن قواعد کلیة تعین	مقدمہ لکھ دوں جس میں وہ اصولی اور
علی فهم القرآن ومعرفة	بنیادی باتیں مذکور ہوں جن سے
تفسیره ومعانیه والتمیز	قرآن مجید سمجھنے اور اس کی تفسیر
فی منقول ذلك ومعقوله	و معانی کو جاننے میں مدد ملے، اور
بین الحق وانواع	ان سے معقول و منقول کے درمیان
الاباطیل، والتنبیه	تمیز اور حق و باطل کے مابین فرق و امتیاز
علی الدلیل الفاصل	ہو سکے، نیز مختلف اقوال کے درمیان
بین الاقاویل[1]	قول فیصل کا پتہ چل سکے۔

آگے لکھتے ہیں:

فان الکتب المصنفة فی	کیونکہ اب تک تفسیر میں جو کتابیں لکھی
التفسیر مشحونة بالغث	گئی ہیں وہ غلط و صحیح، نیز کھرے اور

[1] مقدمہ: ص ۳۳ (طبع دار القرآن الکریم، کویت)

والسمین، والباطل والواضح	کھوٹے کا مجموعہ ہیں۔
والحق السبین[1]	...

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالہ میں صرف وہ قواعد کلیہ ہی بیان کیے گئے ہیں جنکے جاننے سے فہم قرآن میں بڑی مدد ملتی اور حق و باطل (غلط و صحیح) کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، یہاں ان سب اصول و قواعد کو بیان کرنا طوالت کا موجب ہوگا، اس لیے صرف دو امور کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شان نزول کی بحث | کتب تفسیر و حدیث میں بعض آیتوں کا شان نزول متعدد واقعات یا افراد کو بتایا گیا ہے، جب کہ ان واقعات کے درمیان کبھی کبھی برسوں کا فرق ہوتا ہے، اس سے اکثر قارئین کو الجھن اور حیرانی ہوتی ہے اور وہ تطبیق کی راہ نہ پاکر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہ آیت کئی بار نازل ہوئی ہے، شیخ الاسلام ایک مفصل تمہید کے بعد اس گتھی کو اس طرح سلجھاتے ہیں

وقد یجیئ کثیرا قولهم	کبھی کبھی کتب تفسیر و حدیث میں ملتا
هذه الآیة نزلت فی کذا	ہے کہ یہ آیت اس بارے میں نازل
لاسیما ان کان المذکور	ہوئی، اور کبھی مذکور ہوتا ہے کہ یہ فلاں
شخصا۔	شخص کے بارہ میں اتری ہے۔

پھر اس کی متعدد مثالیں کتب حدیث سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

.... ان حکم الآیة مختص	اس کا یہ مطلب تو کسی کے نزدیک بھی
بأولئك الاعیان دون	نہیں ہوتا کہ یہ آیت بس فلاں شخص یا
غیرهم ... هذا لایقوله	فلاں واقعہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے،

[1] مقدمہ ص ۳۳ (طبع دار القرآن الکریم، کویت)

مسلم ولا عاقل على الاطلاق	ایسی بات کوئی مسلمان بلکہ معمولی عقل
.... فلم يقل احد من علماء	والا بھی نہیں کہہ سکتا، البتہ اس کا مطلب
المسلمين ان عمومات	یہ ہوتا ہے کہ اس شخص یا واقعہ سے مشابہ
الكتاب والسنة تختص	جو بھی شخص یا واقعہ ہو اس کے لیے بھی
بالشخص المعين وانما ...	اس آیت میں حکم بیان کیا گیا ہے، اس
تختص بنوع ذلك الشخص	طرح یہ حکم کسی خاص شخص یا واقعہ کے
فتعم ما يشبهه	ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نوع کیلیے
فهى متناولة لذلك الشخص	ہے، اور جو شخص یا واقعہ کسی زمانہ میں
ولغيره ممن كان بمنزلته	بھی اس جیسا ہوگا آیت کا حکم اس سے
..... ومعرفة سبب	متعلق بھی ہوگا، اور آیت کا سبب
النزول يعين على فهم	نزول جاننے سے آیت کے فہم میں
الآية[1]	مدد ملتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شان نزول بتانے والے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ بس یہی شخص یا واقعہ اس آیت کا مخاطب یا اس آیت پر عمل کرنے کا مکلف ہے، بلکہ اس جیسے تمام اشخاص و واقعات کے لیے بھی اسی آیت سے رہنمائی حاصل کی جائے گی، اور اسی کے مطابق ان کو عمل کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ شان نزول کا ذکر بطور مثال ہوتا ہے، یعنی اس جیسی نوعیت میں یہ آیت نازل ہوئی، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ اس واقعہ یا اس شخص کے بارے میں آیت اتری، ظاہر ہے کہ ایک نوعیت کے واقعات کی مثالیں متعدد ہو سکتی ہیں، یہاں مصنف نے اس کے علاوہ اور بھی

[1] مقدمہ: ص ۴۶ - ۴۷۔

مثالیں ذکر کی ہیں، مگر ہم نے اختصاراً اتنے ہی کو کافی سمجھا ہے۔

تفسیر کا بہترین طریقہ شیخ الاسلامؒ نے تفسیر قرآن کا ایک اہم اصول یہ بیان فرمایا ہے جو بعد میں مختلف کتابوں کے اندر مذکور ہونے کی وجہ سے اب مشہور اور عام ہے، اور اس سے اہل علم بھی عموماً واقف ہیں، اس لیے اس میں کوئی خاص ندرت باقی نہیں رہ گئی کہ تفسیر کا سب سے بہتر طریقہ 'تفسیر القرآن بالقرآن' ہے، اس کے بعد 'تفسیر القرآن بالسنۃ' ہے، مصنف نے اس پر بکثرت دلائل قرآن و سنت سے پیش کیے ہیں، اسی سیاق میں حضرت معاذؓ کی وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس سے اجتہاد کی مشروعیت پر استدلال کیا جاتا ہے، شیخ نے اس کی سند کو "جید" قرار دیا ہے[1]، اس کے بعد تفسیر القرآن باقوال الصحابہ کا اصول بتایا ہے اور اس بارہ میں اس اہم حقیقت کیجانب بھی توجہ دلائی ہے:

فانهم ادرى بذلك لما	کیونکہ صحابہؓ قرآن کے نزول کے اوقات
شاهدوا من القرآن والاحوال	و احوال کے عینی شاہد ہیں اس لیے وہ
التى اختصوا بها ولما لهم	معانیٔ قرآن کے سب سے زیادہ جاننے
من الفهم التام والعلم	والے ہیں، نیز انھیں فہم تام اور علم صحیح
الصحيح لاسيما علماءهم	بھی حاصل تھا، خاص طور پر ان میں جو
وكبراءهم كالائمة	علماء، ممتاز لوگ اور ائمۂ ہدایت تھے
الاربعة خلفاء الراشدين	بالخصوص خلفائے راشدین اور عبداللہ
والائمة المهتدين	ابن مسعودؓ کہ انھیں تفسیر کا علم
وعبد الله ابن مسعود.	سب سے زیادہ تھا۔

[1] مقدمہ ص ۹۵۔

یہاں طبری کے حوالہ سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

والذی لا الٰہ غیرہ ما	خدا کی قسم! قرآن کی جو آیت بھی
نزلت آیۃ من کتاب اللہ	اتری میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں
الا وانا اعلم فیمن نزلت	اتری اور کس کے بارے میں
واین نزلت۔	اتری۔

امام ابن تیمیہؒ کا جذبۂ تحصیل علم

اس کے باوجود طلب علم کے جذبہ کا یہ حال تھا کہ فرماتے تھے:

ولو اعلم مکان احد اعلم	اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ دور
بکتاب اللہ منی تنالہ	دراز مقام پر کوئی ایسا شخص ہے جو
المطایا لاتیتہ۔	مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے
...	تو میں اس کے پاس ضرور پہونچوں۔

شیخ اس کے بعد مفسرین صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا تذکرہ کرتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، حبر الامت اور ترجمان القرآن تھے، اور جن کے حق میں آپؐ نے یہ دعا کی تھی:

اللّٰھم فقھہ فی الدین	اے اللہ انھیں دین میں سمجھ بوجھ دے
وعلمہ التأویل۔	اور علم تاویل سکھا۔

اس کے بعد ان کی عظمت کے سلسلہ میں تابعین کے اقوال نقل کرکے لکھتے ہیں:

"حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حج کے موقع پر خطبہ دیا، اس میں سورۂ بقرہ یا سورۂ نور پڑھ کر اس کی ایسی عجیب و غریب تفسیر کی کہ اگر اسے روم اور ترک یعنی غیر مسلم تو میں سن لیتیں تو ضرور اسلام لے آتیں [1]"

تنہا یہی بحث اس قدر متنوع اور کثیر الجہات ہے کہ اس پر مفصل مقالہ یا کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

[1] مقدمہ ص ۹۲۔

عالمی ادب میں الف لیلۃ ولیلۃ کی قدر و منزلت

از

جناب منظور احمد خان صاحب لکچرر شعبۂ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجز حیدر آباد

الف لیلۃ کا انوکھا پن اس کے مختلف راتوں میں بٹے ہونے اور ایک مخصوص مقصد کی تکمیل میں مضمر ہے جو اس کے مقدمہ میں قصہ نگار پر لازم قرار دی گئی ہے، اور یہ مقصد ہے بادشاہ شہریار کو اس کی مملکت کی دوشیزاؤں کے انتقام اور ان کی بیجا قتل و غارت سے باز رکھنا، اس اعتبار سے قصہ گو کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ ان قصوں میں طوالت پیدا کرے، اور اس سلسلہ میں وہ تین مختلف وسائل بروئے کار لایا ہے، ان وسائل میں عربی کی مختلف تاریخی کتب اور ان سے ماخوذ قصوں کو طول دینا اور پھر اپنی طرف سے مزید قصوں کا اضافہ شامل ہے یہاں قصہ گو اپنے مقصد میں بالکل کامیاب نظر آتا ہے، کیونکہ شہرزاد، جو کتاب کے مقدمہ کی رو سے اصل قصہ گو ہے شہریار کو ایک تو اپنے نفس سے دور رکھنے اور دوم اپنی ہزاروں ہم جنس لڑکیوں کے انتقام سے باز رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے [1]۔

اس یکتائی اور کئی دوسری بے شمار خصوصیات کے سبب الف لیلۃ کو پورے عالم میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو دنیا کے کسی دوسرے مجموعۂ قصص کو کبھی میسر نہیں ہوئی، کسی مستشرق نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی شہرت، کو مغربی دنیا میں سوائے تورات کے

[1] سہیر القلماوی، الف لیلۃ ولیلۃ، قاہرہ، سنہ ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

اور کوئی کتاب نہ پا سکی[1] مشہور مستشرق نکلسن کا کہنا ہے کہ الف لیلہ یورپ میں عربی ادب کے کسی بھی ممتاز فن پارے، یہاں تک کہ قرآن پاک سے بھی زیادہ مقبول ہے[2] جب کہ نامور فرانسیسی قصہ نویس وولٹیر کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ وہ اپنی یادداشت کھو دے، تاکہ اسے الف لیلہ پڑھ کر از سر نو لطف حاصل ہو، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اسے اب تک چودہ[14] مرتبہ پڑھ چکا تھا[3]، تاہم الف لیلہ کی اہمیت اور قدر ومنزلت کو محض ان تعریفی کلمات سے نہیں جانا جا سکتا ہے، جب تک کہ اس عظیم کارنامے کے مغربی ادب میں موجود اثرات کو نمایاں نہ کیا جائے۔

گو فرانسیسی مستشرق انطون گالان کے الف لیلہ کے مشہور ترجمے کو یورپ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران اس کتاب کو مقبول عام کرنے میں بڑا دخل رہا، تاہم اس ترجمہ سے کئی صدی قبل بھی کہیں کہیں یورپی ادب پر الف لیلہ کے اثرات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، جب ہم ان وسیلوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن کے توسط سے مغربی ادب الف لیلہ سے متاثر ہوا تو تین طرح کے ذرائع ہمارے سامنے آتے ہیں، پہلا وسیلہ قسطنطنیہ کا شہر ہے، جہاں عربوں اور بازنطینیوں کے درمیان متواتر جنگیں ہوتی رہیں، اور امن کے زمانہ میں مختلف مشرقی ومغربی تجارتی قافلوں کی نقل وحرکت رہی، سپاہیوں اور تاجروں کے اس اختلاط سے الف لیلہ کے کچھ حصے مغرب میں منتقل ہوئے، اور خاص وعام میں ان کا رواج ہوا دوسرا وسیلہ مغرب کے دو مشہور شہر صقلیہ اور طلیطلہ بنے جو ۱۰۸۵ء میں سقوط بغداد کے بعد مشرقی زبانوں سے ترجموں کا مرکز قرار پائے، اس طرح عربی امثال اور عربی قصے کثیر تعداد میں

---

[1] احمد ضیف، الف لیلۃ ولیلۃ، یہ مقالہ مشہور مصری رسالہ "المقتطف" میں مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ [2] R. A. Nicholson, A Literary History of The Arabs. London, 1979, P. 456 [3] سہیر القلماوی ص ۶۹۔

ہسپانوی زبان میں منتقل ہو گئے، جن کا بیشتر حصہ الف لیلہ سے ماخوذ تھا، تیسرا وسیلہ مصر وشام کے وہ مواضعات ہیں جہاں عیسائیوں نے صلیبی جنگوں کے دوران اپنی بالادستی قائم کر لی[1]

وہ مشہور بیزنطی لوک گیت جو نویں اور دسویں صدی عیسوی میں وہاں کے عام لوگوں کی زبان زد تھے اور جو عالم اسلام کی بالعموم اور عالم عرب کی بالخصوص تصویر کشی کرتے ہیں، ان میں الف لیلہ کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، نیز اس کے اثرات ایک نامور اطالوی قصہ نویس جووانی سرکابنی کے ایک قصے میں ٹھیک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح یہ دوسرے اطالوی قصہ نویسوں اسطولفو اور جو کونڈو کے دو قصوں میں ملتے ہیں[2]

الف لیلہ میں پائے جانے والے حیرت انگیز امور اور اس کی بعض شخصیات کے خدوخال بارہویں صدی عیسوی میں وجود میں آنے والے نیبلونگن نامی جرمن ملحمہ میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح ہسپانوی ڈرامہ نویس کالڈرون دی لابر کے ڈرامے "زندگی اک خواب" (LA VIDA ES SUENO) میں الف لیلہ کی "النائم والیقظان" یا "ابو الحسن المغفل وھارون الرشید" نامی کہانی کے اثرات نمایاں طور پر جھلکتے ہیں[3]

مذکورہ بالا گالان کے کامیاب ترجمہ نے کئی دوسرے یورپی ادیبوں کو الف لیلہ کے طرز پہ قصے کہانیاں وضع کرنے پر آمادہ کیا، چنانچہ فرانسیسی قلمکار گیزیٹ نے ایک دلچسپ مجموعۂ قصص شائع کیا جسے اس نے "الف لیلہ کی تکمیل" (SUITE DE 1001 NUITS) کا نام دیا، جب کہ بروٹن نے الف لیلہ کے اپنے انگریزی ترجمہ کے علاوہ مزید سات اجزاء شائع کیے، اور ان کا نام "الف لیلہ سے پیوستہ راتیں" رکھا، اس تقلید نے آگے چل کر الف لیلہ کے قصوں سے

---

[1] فاروق سعد، من وحی الف لیلۃ ولیلۃ ج ۱، بیروت ۱۹۶۲ء ص ۷۵، ۷۶ [2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ مرتب کردہ دانش گاہ پنجاب، لاہور [3] فاروق سعد ص ۷۴، ۷۵۔

مشابہ دوسرے مشرقی قصوں کو بھی اپنے اندر سمو لیا، اس طرح مختلف مشرقی قصے جن میں فارسی، ترکی، مغل اور تاتاری قصے شامل ہیں، الف لیلہ کے غیر شائع شدہ حصے کے طور پر یورپ میں رواج پا گئے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ الف لیلہ نے مغربی ادباء اور قارئین دونوں کے دلوں میں ان اقوام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی زبردست خواہش پیدا کی جنھوں نے اس عظیم شاہکار کو جنم دیا ہے، اور جن کے حالات و واقعات اس میں قلمبند ہیں، اس طرح مختلف ادباء نے مشرق کا رُخ کرکے اپنے مستقل سفرنامے ترتیب دیے، ان ادباء میں ایڈورڈ لین کا نام قابلِ ذکر ہے جس نے مشرق کی بالعموم اور مصر کی بالخصوص نہ صرف سیر کی، بلکہ وہاں ایک مدت تک قیام کیا، اور اس کے بعد جب اس نے الف لیلہ کا ترجمہ ہاتھ میں لیا، تو اس پہ جابجا تبصرے کیے، یہاں تک کہ یہ تبصرے ایک مستقل کتاب کی صورت میں سامنے آئے۔

الف لیلہ کے شاعرانہ اور ساحرانہ انداز اور ماحول نے اہلِ مغرب کے خیال کو وصف اور تمثیلی مناظر کے اعتبار سے نہایت وسعت بخشی اور اس کے جوش و اثر سے بھرے ہوئے حوادث و جذبات نے مغربی قصہ نویس کو نئے آفاق میں پہونچا دیا، ڈرامہ نویس کے قلم کو اس نے سرائے، تاجروں کی دکان، غلاموں کے بازار، عورتوں کے حمام اور سحر کی بے شمار صورتوں کے تصور سے روشناس کیا، نیز اس نے مغربی ادب میں جن اور حیوانات کے قصے داخل کرکے اسکے موضوعات کی فہرست میں اسی طرح اضافہ کیا جس طرح اس نے فن موسیقی، رقص اور مصوری کے موضوعات میں اضافہ کیا۔[1]

اٹھارہویں صدی کا مغربی قصہ جو اجتماعی، تعلیمی اور فلسفیانہ موضوعات پر مبنی تھا الف لیلہ سے

[1] سہیر القلماوی، ص ۶۴، ۶۶، ۶۹، ۷۱۔

بڑی حد تک متاثر نظر آتا ہے، اور اس کا یہ اثر انیسویں صدی میں امریکہ تک پہونچ گیا، محققین نے اس اثر کا انکشاف مختلف انگریزی ادیبوں، مثلاً ٹینیسن، ڈی کونسی اور سٹوڈ کے فن پاروں میں کیا ہے، اور بعض محققین شکسپیر کے مشہور ڈرامے ("The Taming of The Shrew") میں "ابوالحسن المغفل و ہارون الرشید" نامی کہانی کی بازگشت پاتے ہیں، اسی طرح اس کے دوسرے تمثیلیات (The Tempest)، (Othello) اور (Macbeth) میں بھی الف لیلہ کے بعض آثار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔[1]

الف لیلہ نے متواتر اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی اور رومانوی شاعری اور انیسویں صدی کے فرانسیسی، جرمن اور انگریزی شاعری میں رمزیت کی تحریک پر زبردست اثر ڈالا، اسی طرح مغربی دنیا کا بچوں کا ادب بھی اس کے سرچشموں سے خوب سیراب ہوا، کیونکہ اس ادب کے ضروری عناصر الف لیلہ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، کہا جاتا ہے کہ ادب الاطفال کے بے تاج بادشاہ ڈینمارک کے ہنس اینڈرسن نے اپنی تصنیفات میں الف لیلہ کے قصوں کا بڑا سہارا لیا ہے، اور اکثر مقامات پر اس نے اس کتاب کے قصوں کو براہ راست نقل کیا ہے، جو بعد میں اتنے مقبول ہوئے کہ اس صنفِ ادب کا جزء لاینفک بن گئے، اس سلسلہ میں علاء الدین، علی بابا اور سندباد جیسے قصوں کا نام لیا جاسکتا ہے جو قارئین کے ذہنوں پر ایک مدت تک چھائے رہے۔[2]

ضرورت اس بات کی ہے کہ الف لیلہ کے مغربی ادب میں موجود اثرات کا مکمل جائزہ لیا جائے، تاکہ اس عالمی شاہکار کی قدر و قیمت مزید نمایاں ہو، علاوہ ازیں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ برصغیر کے ادب میں بھی اس کے اثرات کی نشاندہی کی جائے کیونکہ الف لیلہ کا اثر قبول کرنے میں، برصغیر کا ادب مغربی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔

[1] فاروق سعد ص ۷۵، ۷۶، [2] سہیر القلماوی ص ۶۸-۶۹۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی وفات

تعزیتی تار، تجاویز اور خطوط

جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب ناظم دارالمصنفین کی وفات پر ملک اور ملک کے باہر بڑا ماتم ہوا، ابھی تک تعزیتی خطوط برابر موصول ہو رہے ہیں، کارکنان دارالمصنفین ان تمام حضرات اور اداروں کے شکر گذار ہیں، جنھوں نے خطوط، تار اور تعزیتی تجویزیں بھیجیں، پہلے ان حضرات کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں، جنھوں نے تار بھیج کر تعزیت کی تھی۔

تار

مندرجۂ ذیل حضرات کے تعزیتی تار موصول ہوئے ہیں۔

(۱) جناب نورالحسن گورنر مغربی بنگال۔ (۲) جسٹس خواجہ محمد یوسف کلکتہ (۳) مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند دہلی۔ (۴) مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ (۵) مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ (۶) پروفیسر فخرالحسن صدر مجلس علوم اسلامیہ کراچی (۷) مرکز جماعت اسلامی پاکستان، لاہور۔ (۸) حاجی عبدالغنی صدر جمعیۃ علمائے احمد آباد۔ (۹) جناب سلیم شروانی ممبر پارلیمنٹ و مالک جیپ کمپنی الہ آباد۔ (۱۰) جناب علوی صاحب منیجر جیپ کمپنی الہ آباد۔ (۱۱) منشی عبدالعزیز صاحب بمبئی۔ (۱۲) مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی سابق وزیر اترپردیش مئو (۱۳) ڈاکٹر شعیب اعظمی صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ (۱۴ و ۱۵) جناب سہیل سلطان و اہلیہ سہیل صاحب کراچی۔ (۱۶) جناب محمود شوکت سلطان صاحب کراچی۔ (۱۷) جناب شانتی سروپ صاحب دہلی

(۱۸) جناب مولوی حاجی معین الحق اعظمی حاجی جمنو، کانپور (۱۹-۲۰) حکیم عبدالحمید و سید اوصاف علی نئی دہلی

تجاویز

ذیل میں ان اداروں کے نام تحریر کئے جاتے ہیں، جن کی جانب سے تعزیتی تجاویز موصول ہوئیں

(۱) مجلس علوم اسلامیہ کراچی۔ (۲) دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا سوسائٹی حیدر آباد۔ (۳) ایران سوسائٹی کلکتہ۔ (۴) ادارہ دعوۃ السلفیہ لاہور، پاکستان۔ (۵) شعبہ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۶) شعبہ علوم اسلامیہ و شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۷) اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ۔ (۸) اترپردیش اردو اکاڈمی اسٹاف کلب لکھنؤ۔ (۹) عبدالرحمان خاں جنرل سکریٹری اترپردیش کانگریس آئی کمیٹی و وائس چیرمین قومی یکجہتی کونسل اترپردیش لکھنؤ (۱۰) دینی تعلیمی کونسل اترپردیش لکھنؤ۔ (۱۱) انجمن تعلیمات دین ضلع بستی۔ (۱۲) پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ (۱۳) سکریٹری ٹیچر ایسوسی ایشن شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ (۱۴) پرنسپل شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڈھ (۱۵) پرنسپل ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ۔ (۱۶) منیجر ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ۔ (۱۷) مدرسہ نسواں انٹر کالج اعظم گڈھ (۱۸) مہتمم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال۔ (۱۹) جامعہ رحمانیہ خانقاہ مونگیر۔ (۲۰) معتمد دارالعلوم خلیلیہ و سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک۔ (۲۱) ادارہ درس قرآن دیوبند۔ (۲۲) دارالعلوم الاسلامیہ بستی (۲۳) انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔ (۲۴) مہتمم دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر سورت گجرات (۲۵) صدر مدرس مدرسہ دارالعلوم بسوریا ضلع چمپارن۔ (۲۶) نائب ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، اعظم گڈھ۔ (۲۷) جامعہ فاروقیہ صبرحد ضلع جون پور (۲۸) ممبر سید احمد ہائر سکنڈری اسکول صبرحد ضلع جونپور۔ (۲۹) اساتذہ ابراہیم بابا بڈھا کورہائی اسکول ترلوٹ (۳۰) پرنسپل ایم۔ اے۔ ہائی اسکول پٹنہ (۳۱) اینگلو اردو جونیر کالج جلگاؤں۔ (۳۲) صدر انتظامیہ کمیٹی دارالمطالعہ اناوہ (۳۳) ممبر اقبال پبلک اسکول مئو ناتھ بھنجن اعظم گڈھ۔ (۳۴) ناظم مدرسہ تعلیم الاسلام جیراجپور، اعظم گڈھ۔ (۳۵)

ادارۂ یونیورسل بک کمپنی، لکھنؤ۔ (۳۶) اردو لائبریری خیر آباد، اعظم گڈھ (۳۷) انجمن نادیۃ الاتحاد جدید طلبہ اعظم گڈھ دار العلوم دیوبند۔ (۳۸) ندوۃ الطلبہ مرکزی دار العلوم بنارس۔ (۳۹) بزم فیض انجمن طلبائے مدرسہ اسلامیہ کرامتیہ جلال پور فیض آباد (۴۰) ضلع کانگریس کمیٹی (جے) اعظم گڈھ (۴۱) مسلم وکلا ہائی کورٹ الٰہ آباد۔ (۴۲) انکم ٹیکس بار ایسوسی ایشن، اعظم گڈھ، (۴۳) ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، اعظم گڈھ۔ (۴۴) سول کورٹ بار ایسوسی ایشن اعظم گڈھ (۴۵) انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن شاخ اعظم گڈھ (۴۶) سکریٹری۔ اعظم گڈھ پترکار سمیتی۔ (۴۷) المعہد الاسلامی العلمی۔ پٹن۔ گجرات۔

بیرون ملک کے خطوط

اب منتخب تعزیتی خطوط شائع کئے جا رہے ہیں پہلے وہ خطوط درج کئے جاتے ہیں۔ جو بیرون ملک سے موصول ہوئے ہیں۔

رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔

یکم جمادی الاول ۱۴۰۸ھ

مکرمی سید شہاب الدین دسنوی حفظ اللہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ سے یہ معلوم کرکے بڑا افسوس ہوا، کہ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب سابق ناظم دار المصنفین (شبلی اکیڈمی) لکھنؤ میں سڑک کے ایک حادثہ میں وفات پا گئے، ہماری جانب سے تعزیت قبول فرمائیے، اللہ تعالے سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس نصیب فرمائے، اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات کے بعد آپ لوگوں پر دار المصنفین کی جو بھاری ذمہ داریاں آگئی ہیں اللہ تعالے ان سے عہدہ برآ ہونے نیز ان امور کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے جن میں اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی ہے۔

والسّلام۔ عبد اللہ عمر نصیف جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی،

۲۳ نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی ومحترمی۔ جناب مولوی ضیاء الدین صاحب

السّلام علیکم۔

اخبار نوائے وقت میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب کے دردناک سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ ہوا، ان کی معصوم شکل وصورت نگاہ میں پھرنے لگی، دار المصنفین کے سمینار دسمبر ۱۹۸۲ء میں مرحوم نے جس محبت وشفقت سے میری خاطرداری کی تھی، اس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ وہ مہر ومحبت، حلم وانکساری، نرم خوئی اور اعتدال وسلامت روی کا پیکر تھے۔

مرحوم ایک ممتاز مورخ اور نامور انشاپرداز تھے، معارف میں ان کے شذرات اسلامیان ہند کے دلی جذبات واحساسات کے ترجمان اور رشحاتِ میرکی یاد میں ان کے مضامین (وفیات) شخصیات نگاری اور ادب وانشاء کا خوبصورت مرقع ہوتے تھے۔

میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے قلم کو کسی کی تنقیص یا تحقیر سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔

مرحوم کے دونوں ملکوں (بھارت اور پاکستان) کے اہل علم سے یکساں ذاتی روابط تھے، اس لیے وہ ہر جگہ اور ہر محفل میں مقبول ومحترم تھے، بلکہ ادھر چند برسوں سے وہ بین الاقوامی شخصیت بن گئے تھے۔

دار المصنفین کی مالی حالت کو مضبوط ومستحکم بنانے میں جس طرح انھوں نے اپنا خون اور پسینہ ایک کر دیا تھا، وہ محتاج بیان نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالے اس شہید علم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کے متعلقین اور رفقاء کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور آپ سب کو دار المصنفین کی دینی وعلمی روایات کو قائم ودائم رکھنے کی

توفیق ارزانی فرمائے۔

گذشتہ ہفتے میں نے اپنے مضمون "ابن عطیہ اندلسی" کی بعض تصحیحات لکھ کر بھیجی تھیں، ان کو معارف کی کسی اشاعت میں شامل کردیں۔ فقط والسلام

شریک غم (شیخ) نذیر حسین، مدیر

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۲۲- نومبر ۱۹۸۲ء

سوگوار محترمہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

حیدرآباد دکن گیا ہوا تھا، کل لوٹا تو محترمی سید صباح الدین صاحب کے جانکاہ سانحہ کی اطلاع پاکر دم بخود رہ گیا۔ انھیں شہادت مل گئی۔ مگر ہم پس ماندگان کے لیے کیسی محرومی ہوگئی۔ آپ کے صدمہ کا اندازہ تو کوئی دوسرا کر بھی کیا سکتا ہے، مگر انشاء اللہ صبر جمیل کے ذریعہ آپ اسی تناسب سے اجر بھی بے حد وحساب پائینگی، اللہ تعالےٰ آپ کے مغموم ومحزون قلب کو سکینت بخشے اور اپنی دستگیری شامل حال رکھے۔

میری اہلیہ بھی بعد سلام آپ سے تعزیت کرتی ہیں، شریک غم ہیں، اور دعا گو ہیں، کہ آپ اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو، اور مرحوم کو مغفرت کاملہ اور محبّت بے پایاں میسر رہے۔

صاحبزادہ سلمہٗ اور صاحبزادیاں سلمہا کو بھی اللہ تعالےٰ صبر جمیل عطا فرمائیں۔

فون پر عزیزی راشد مصطفیٰ صاحب سے تعزیت کرلی تھی، انشاء اللہ کل ہم دونوں ان کے گھر جاکر تلقین صبر کرینگے۔

محزون

غلام محمد۔ کان اللہ لہٗ

۲۵۵- بلاک ۷، ۵، سی پی برار سوسائٹی کراچی۔

حضرت المکرم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال کی خبر نے دل وجان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ بات تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ یک لخت ہم سے منہ موڑ لیں گے، ابھی تو مرحوم کو بہت سے کام انجام دینے تھے، تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق کو سمیٹنے اور پھر انھیں ترتیب دینے کے ان گنت مراحل باقی تھے، مگر قضا وقدر نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ ملّت کے گم گشتہ خزینے کا مزید سراغ لگاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات اسلامی تاریخ ہی کے لیے نہیں دنیائے ادب کے لیے بھی عظیم نقصان کا باعث بنی ہے، جس کی تلافی ناممکن ہے۔

مجھے احساس ہے کہ وابستگان دارالمصنفین پر اس سانحہ سے قیامت ٹوٹی ہوگی، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی جدائی کا زخم ابھی مندمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ صباح الدین صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس غم میں آپ لوگوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوں کہ وہ میرے چچا ہی نہیں تھے۔ میرے والد مولانا شاہ منظور الرحمٰن کے ہم جماعت ہی نہ تھے، میرے مربّی، میرے محسن اور میرے رہنما بھی تھے۔ اللہ تعالےٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین!

مولانا پر میرا ایک مضمون مقامی اخبار میں شائع ہوا ہے۔ تراشا منسلک ہے، فقط

آپ کا نیاز مند

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

ناظم۔ دفتری اردو پراجیکٹ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،

اسلام آباد

ادارۂ تحقیقات اسلامی

شاہ فیصل مسجد، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵

اسلام آباد (پاکستان)

تاریخ ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء

مکرمی! حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب　　دامت برکاتہم العالیہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی وفات کی اچانک خبر از حد رنج و غم کا سبب ہوئی، ادارۂ تحقیقات اسلامی سے ان کا خصوصی لگاؤ اور محققین سے ذاتی روابط کے سبب اس خبر نے ادارہ کے ہر رکن کو سوگوار بنا دیا۔

بلاشبہ دار المصنفین ایک اعلیٰ پایہ کے محقق، مفکر اور مورخ سے محروم ہو گیا، یہ نقصان صرف دار المصنفین کا ہی نہیں بلکہ ہم سب کا ہے، اس لیے کہ مرحوم کی علمی و تحقیقی خدمات سے ہم سب نے یکساں اکتساب فیض کیا ہے۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی نے مجلہ فکر و نظر کے شمارہ جنوری تا مارچ کو مولانا مرحوم کے لیے مختص کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ طے پایا کہ اس نمبر کو تین ابواب میں منقسم کیا جائے گا، باب اوّل مولانا مرحوم سے متعلق معلوماتی اور تاثراتی مضامین پر مشتمل ہوگا۔ باب دوم میں ان مقالات کو شامل کیا جائے گا جو مولانا کے علمی و تحقیقی کارناموں سے متعلق ہوں گے جب کہ تیسرے باب میں مولانا کے منہج تحقیق یعنی تصوف اور اسلامی تاریخ کے کسی بھی پہلو پر دستیاب تحقیقی مقالات شامل اشاعت ہوں گے۔

جناب والا خود اور ندوۃ العلماء کے دیگر رفقاء مذکورہ گذارشات کی روشنی میں اپنے مقالات سے سرفراز فرمائیں تو میں ذاتی طور پر بھی اور مجموعی طور پر پورا ادارہ احسان مند ہوگا۔

امید ہے، آپ میری درخواست کو شرف پذیرائی بخشیں گے۔

والسّلام۔ نیاز کیش

(ڈاکٹر شیر محمد زمان)

ڈائرکٹر جنرل ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔ پاکستان

۱۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء

ابھی موتمر کراچی کے ہفتہ وار "مسلم ورلڈ" سے اطلاع ملی کہ ہمارے عزیز دوست اور بلند پایہ مصنف صباح الدین صاحب ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صباح الدین کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم اشک ریز ہے، مگر مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ کی رو سے یہ کہنا صحیح ہے کہ۔　ع　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس خاکدان میں عمر طبعی بھی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، مگر اس حقیقت کے باوجود کہ صباح الدین نے عمر طبعی پائی تھی، پھر بھی ان کا علمائے تاریخ اور اردو کی آراستہ بزم سے روپوش ہو جانا زبان اور ملت دونوں ہی کے لیے ایک دردناک سانحہ ہے۔

فروغ شمع جو اب ہے رہیگا صبح محشر تک　　مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے جو شمعیں روشن کی تھیں انکی تابناکیوں کو قائم رکھنا کچھ آسان نہ تھا۔ تاریخی دستاویزیں جو انھوں نے ہمیں عطا کی ہیں، وہ ابد الآباد تک گمراہ مصنفین اور نام نہاد مورخین کی غلط بیانیوں پر احتجاج کرتی رہیں گی۔ تاریخی واردات سے کہیں زیادہ

اسلامی ثقافت کا یہ تاج محل روشن رہا کرے گا یہ وہ شالامار ہے جس کی روشنی رہنمائی کرتی رہے گی۔ ہاں اب وہ پیوند خاک ہو چکے ہیں مگر ان کے کارنامے زندۂ جاوید ہیں، رومی نے سچ کہا ہے۔

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

اللہ پاک مرحوم کے وابستگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

خاکسار

اختر امام کراچی

۲۳ نومبر ۸۳ء

مکرم و محترم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھنؤ میں ایک حادثہ میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اطلاع پاکر ہمیں انتہائی سخت صدمہ ہوا۔ اور اس اچانک حادثہ کی خبر پاکر ہم تو حواس باختہ ہو گئے۔ ابھی چند دنوں پہلے ان کے کراچی کے دوران قیام میں انکے داماد ڈاکٹر سید راشد مصطفٰے صاحب کی قیام گاہ پر طویل صحبتیں رہیں، اور یہ صحبتیں جب یاد آتی ہیں تو ہماری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، وہ ان کا پُر سکون انداز گفتگو اور مختلف موضوعات پر انکی عالمانہ اور معلومات سے پر تبصرے ابھی تک ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں،

وہ آئے بھی اور گئے بھی نظاروں میں انکے سہارے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہی ہیں یہ آ رہی ہیں وہ جا رہی ہیں

مگر کیا خبر تھی کہ وہ اب ایسی جگہ جا چکے ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، انکے قارئین انکے جاننے والے اور ملنے والے کون ہونگے جو سوگوار نہ ہوں گے۔

ان کی وفات سے علمی دنیا ایک نابغہ محقق، مورخ اور ایک قابل ادیب سے محروم ہو گئی ہے

خصوصاً دارالمصنفین اور اس کے ترجمان ماہنامہ معارف میں انکی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسکا پر کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ مگر اللہ تعالے کی مشیت میں کسی کو دخل نہیں ہے، اور ہم سب اس معاملے میں بالکل بے بس ہیں کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

اللہ تعالے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا کرے اور ان کی تربت کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے بھر دے۔ آمین

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اللہ تعالی آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے، اور ہمت و حوصلہ سے نوازے، اور آپ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقدس ورثہ کو اور دارالمصنفین کی اعلی علمی روایات کو قائم رکھیں اور معارف کو اس کی تمام تر خوبیوں اور اس کی علمی تحقیقی اور ادبی حیثیت کو پوری طرح قائم رکھیں گے۔

اللہ تعالے اس کے لیے آپ کو ہمت اور حوصلہ عطا کرے۔ آمین۔

ہماری طرف سے ہمارے یہ جذبات اور تعزیت سید صاحب کے صاحبزادوں اور اہل خاندان تک پہونچا دیں۔ اللہ تعالے انکو یہ جانکاہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے اور صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

والسلام

آپ کے مخلصین اور سید صاحب مرحوم کے سوگوار۔ حاجی علی محمد باکولا والے
اے ایس فولو الا مولوی عبدالشکور سٹریٹ ۴ہ۔ دھوراجی کالونی کراچی پاکستان

۲۵ نومبر ۸۳ء

برادر محترم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی۔ دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ نہایت حزن و ملال کے ساتھ محترم سید صباح الدین صاحب

کے سانحۂ ارتحال کی اچانک خبر سنی۔ دل و دماغ پر شدید اثر ہوا، اللہ تبارک و تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے، انھوں نے ۵۲ سال تک دارالمصنفین جیسے عظیم الشان ادارہ کی ہر طرح کی خدمت کی، ان کے قلم سے ہزاروں صفحات علماء و مشائخ اور اولیاء اللہ کے حالات اللہ تعالےٰ نے تحریر کرائے، ہندوستان میں اسلامی تاریخ کی صیانت وحفاظت کا عظیم کام انجام دینے کی توفیق ہوئی۔ اس ناچیز سے جو تعلق تھا وہ جناب کو بخوبی معلوم ہے، اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کن الفاظ میں آپ کو اور دارالمصنفین کو تعزیتی خط تحریر کروں، یہاں کے انگریزی اخبار خلیج ٹائمز سے ہم لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی، دنیا کی بے ثباتی کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔ ابھی چند ماہ پیشتر آپ کی موجودگی میں ان سے وہاں کے مسائل پر باتیں ہوئی تھیں۔ انھیں دارالمصنفین سے عشق و محبت کا درجہ حاصل تھا، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ یہ عظیم الشان ادارہ ہر طرح کے شرور و فتن سے محفوظ رہ کر اپنی وہ علمی و ادبی خدمت انجام دیتا رہے جو اس کے قیام کا مقصد تھا۔ ہر طرح اس کے لیے دعاگو ہوں۔ مرحوم کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا، وہاں کے تمام رفقاء و متعلقین کو سلام مسنون اور ان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں، اس سے پہلے حضرت مولانا علی میاں صاحب[1] مدظلہٗ کو خط تحریر کر چکا ہوں۔ غالباً شروع جنوری میں ہندوستان حاضری کا موقعہ ملے۔ بقیہ حالات بہتر ہونگے۔ فقط والسلام

مخلص تقی الدین ندوی

۲۳ نومبر ۸۵ء — استاذ حدیث عین یونیورسٹی، متحدہ عرب امارات

مخدومی و مطاعی زادت معالیکم!

سلام و رحمت! امید ہے کہ مزاج سامی بخیریت ہوں گے۔ ۱۹ نومبر کے مقامی انگریزی اخبار خلیج ٹائمز میں یہ المناک خبر اچانک دل و دماغ پر بجلی بن کر گری کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ۱۸ نومبر کو لکھنؤ میں ایک ٹریفک حادثہ کا شکار ہو کر راہی عالم جاودانی ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ابھی ایک ماہ قبل جب اپنی سالانہ رخصت پر میں وطن حاضر ہوا تھا۔ تو مرحوم سے کئی بار دید و شنید کی سعادت حاصل رہی تھی، آہ کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے، دیرینہ شفقت ومحبت سے پیش آئے تھے، ان کے اچانک انتقال سے دارالمصنفین میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا بے حد مشکل ہے، اللہ جل شانہٗ اپنی شان کریمی سے اس عظیم ادارہ کی نگہبانی فرمائے، اس ناقابل تلافی حادثہ پر ہم سب ہی ایک دوسرے کی تعزیت کے مستحق ہیں، اس وقت میں خود بھی حزین و کئیب اور افسردہ خاطر ہوں، کس کو کن الفاظ میں تعزیت پیش کروں، خدا ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے دل و دماغ پر یہ حادثہ اس طرح مستولی ہے کہ فی الحال پیش نظر سطور سے زیادہ لکھنے کے لائق نہیں ہوں۔

والسلام

خادم نعیم صدیقی

دائرۃ القضاء الشرعی۔ ابوظبی

[1] حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام۔ (معارف)

مسقط۔ عمان
۶ دسمبر ۸۵ء

برادر محترم جناب احتشام الرحمٰن صاحب

محترم و مکرم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی، و محترم و مکرم جناب زبیری صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

نومبر کا معارف ملا جس میں جناب محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی اچانک حادثاتی موت کی خبر تھی! جب سے یہ خبر پڑھی ہے۔ دل بہت مغموم ہے کہ ان کے بچے ایک شفیق باپ کی

شفقت، ہندوستان کے مسلمان کے ایک باحیثیت انسان کی خدمت اور برصغیر کے علما اور دانش ور ایک صاحب علم و فضل شخصیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے ہیں !!

آہ! "معارف" کے صفحات پر علم و حکمت کے موتی بکھیرنے والا اولوالعزم انسان ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا! اپنے عظیم استاد جناب سید سلیمان ندویؒ کی تعلیمات کا حق ادا کرنے والا انسان ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گیا۔!

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ہر انسان کو اس عالم ناسوت کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے جانے سے علم و فضل کی کائنات ویران ہو جاتی ہے اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، وہ پر نہیں ہوتا۔ اور میرے نقطۂ نگاہ میں یہ ایک تاریخی تنزل ہے۔ روز بروز قحط الرجال میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن (مرحوم) کے دو ذاتی خطوط کچھ دن ہوئے ملے تھے۔ سوچ رہا تھا کہ آج یا کل جواب دوں گا۔ افسوس! وہ میرے جواب سے پہلے ہی اس عالم میں چلے گئے۔ جہاں پر جانے والے پھر اس عالم ناسوت میں قدم نہیں رکھتے۔

میں رفقائے دار المصنفین اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن سے ایک غائبانہ تعارف رکھتا ہوں۔ لیکن میں جناب سید صاحب کے علمی فیضان سے بہت محظوظ ہوتا رہا۔ جس دردمندی کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی علمی خدمت کی ہے۔ شاید ہی بعد میں آنے والوں میں سے کوئی ایسا ہو۔!

پتہ نہیں اب "معارف" کا حق کون ادا کرے گا۔! میری دعا اور خواہش ہے کہ اب جناب سید ابو الحسن ندوی اس شمع کو روشن کریں کہ شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی ارواح عالم برزخ میں مسرت و سکون محسوس کریں۔

میری دعا ہے۔ کہ اللہ کریم مسافر عدم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل کی نعمت عظمیٰ سے نوازے۔ آمین! ثم آمین۔

شاید جناب سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد جناب سید صاحب کی روح اسی عالم کے لیے بے قرار تھی۔!

اللہ تعالےٰ آپ کے حامی و ناصر ہوں۔

مخلص گلزار احمد

۲۳ نومبر ۱۹۸۷ء

برادر مکرم ضیاء الدین صاحب!

سلام و رحمت - امید ہے کہ آپ ہر طرح بخیریت ہوں گے۔ ۱۹ نومبر کے مقامی انگریزی اخبار "خلیج ٹائمز" میں یہ المناک خبر اچانک دل و دماغ پر بجلی بن کر گری کہ محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ۱۸ نومبر کو لکھنؤ میں ایک ٹریفک حادثہ کا شکار ہو کر راہی عالم جاوداں ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ایک ماہ قبل ہی تو ان سے دید و شنید کی سعادت حاصل ہوئی تھی، آہ کیا معلوم تھا کہ یہ اُن سے آخری ملاقات ہے۔ دیرینہ شفقت و محبت سے پیش آئے تھے۔

مرحوم کے اچانک انتقال سے دار المصنفین میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا پُر ہونا بیحد مشکل ہے۔ اللہ جل شانہ اپنی شان کریمی سے اس عظیم ادارہ کی نگہبانی فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ناقابل تلافی حادثہ پر ہم سب ہی ایک دوسرے کی تعزیت کے مستحق ہیں۔ اس وقت میں خود بے حد حزین دلگیر اور افسردہ خاطر ہوں۔ کس کو کن الفاظ میں تعزیت پیش کروں۔ خدا ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے دل و دماغ پر یہ حادثہ اس طرح مستولی ہے کہ فی الحال

پیش نظر سطور سے زیادہ لکھنے کی تاب نہیں ہے۔ غمزدہ پسماندگان کو میری طرف سے تعزیت پیش کر دیں۔ تمام رفقائے دارالمصنفین اور مولوی عبدالباری صاحب وغیرہ کی خدمت میں بھی میری جانب سے دلی تعزیت پیش فرما دیں۔ احتشام الرحمٰن کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔

والسّلام

آپ کا نعیم صدیقی۔ دائرۃ القضاء الشرعی ابوظبی

۱۰ دسمبر ۱۹۸۷ء

مکرمی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

سلام و رحمت!

اکتوبر ۱۹۸۷ء کا "خبرنامہ" (پٹنہ، آج ملا، اس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے حادثۂ جانکاہ کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

لاہور اور دلی میں کئی بار سمینار کے سلسلے میں مرحوم کا نیاز حاصل ہوا تھا۔ مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ مرحوم ہماری قومی اور ملی روایات کے نمائندہ تھے، اور علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی ادبیات کے ایسے درخشندہ ستارہ تھے۔ کہ ان کی وفات کے بعد بھی اس کی تابانی باقی رہےگی۔ خصوصاً معارف کے ذریعہ ان کی اہم خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دارالمصنفین کا ایک مضبوط ستون منہدم ہو گیا۔ جس سے اس ادارے کو ناقابل تلافی خسارہ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ آپ اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔!

سوگوار۔ کلیم سہسرامی

پروفیسر و صدر شعبۂ السنہ، راجشاہی یونیورسٹی
بنگلہ دیش

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے۔ (معارف)

علماء و مشائخ کے خطوط

بیرون ملک کے علاوہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان میں سے منتخب خطوط پیش کیے جاتے ہیں، پہلے علماء و مشائخ کے خطوط ملاحظہ ہوں۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۷ء / ۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

مکرمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

کل ناگاہ یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ محب مکرم صباح الدین صاحب نے سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس خبر وحشت اثر سے مجھ پر سکتہ سا ہو گیا۔ بھائی میرے! بڑا سخت سانحہ ہوا۔ نہ صرف شخصی و ذاتی۔ بلکہ قومی و ملی و علمی و ادبی (آگے جو کہہ لیجیے) یہ ایسا نقصان عظیم ہوا ہے، جو بیان سے باہر ہے ع وکلنہ بنیان قوم تھدّما۔

آہ۔ دوسروں کی غمگساری کرنے والا، ملک و ملت کا ایسا درمند کہ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔" کا مصداق، گذر جانے والی شخصیتوں کا ماتم گسار، اور ان کی سچی و صحیح تصویر پیش کرنے والا، ایسا اب نہ رہا۔ ادارۂ دارالمصنفین کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہے پس اللہ تبارک تعالےٰ اس خلا کو پورا فرمائے۔ اور اس کی تلافی کا بہتر سامان کر دے علیہ یتوکل المؤمنون۔ مرحوم و مغفور کے بعد دارالمصنفین میں میرے شناسا آپ ہی ہیں اسلئے تعزیت کے لیے آپ کو لکھ رہا ہوں، اس فقید بھائی کے متعلقین (اہلیہ محترمہ اور لڑکے) وہاں ہوں تو ان کو میری طرف سے بادیدۂ تر تعزیت مسنون پیش کریں اور صبر و سکون و تحمل کی تلقین کریں۔ کیونکہ ان اللہ مع الصابرین

میں بہت بڑا اجر و ثواب، مصیبت زدوں کو بخشا گیا ہے، موت حق کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ برادر مکرم! معلوم ہوا کہ یہ حادثہ لکھنؤ میں پیش آیا۔ دیار غربت کی موت اور شہادت کی موت، دونوں کے ثواب کے وہ مستحق ہوئے۔ اللہ اللہ کیا کیا اس کے مصالح ہیں اور کس کس طرح نوازش و کرم ہوتا ہے وہی جانتا ہے، ہم کوتاہ بیں اسکو کیا سمجھیں۔ غفر اللہ لہ و رحمہ رحمۃً واسعۃً۔ تدفین تو غالباً دار المصنفین میں عمل میں آئی ہوگی۔ تفصیلات جاننے کے لیے ایک گونہ بیقرار ہوں۔ سلامٌ علی النجد و من حل بالنجد کے تحت دار المصنفین اور اس کے تمام رفقاء کو میرا سلام اور پیام تعزیت عرض ہے۔

والسّلام

عاجز عون احمد قادری

۹؍ نومبر ۱۹۸۷ء

لال محل بستی نظام الدین اولیا۔ نئی۔ دہلی۔

زیدجاہ زاد الطافہ

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

بھائی! شفیق محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے حادثہ ارتحال کی اطلاع ملی، بہت ہی افسوس ہوا۔ وہ مشرقی و مغربی علوم و تہذیب کے سنگم تھے۔ قلم کے بھی دھنی تھے، ایسے باکمال خال خال ہی عالم وجود میں آتے ہیں، ان کے عالم باقی کو تشریف لے جانے سے جو جگہ خالی ہوئی ہے، اللہ ہی پُر کرے تو پُر ہو، ورنہ ہوتا یہی رہا ہے کہ جو گیا اسکی جگہ پُر نہیں ہو سکی، وہ مجھ پر بیحد شفقت فرماتے تھے، وہ خاندانی اوصاف سے مالا مال تھے، اور مردم شناس بھی۔ پچھلے دنوں ان کا گرامی نامہ آیا تھا، خیر! خداوند قدوس مغفرت فرمائے درجات بلند کرے، اور جوار رحمت میں جگہ دے۔ وہ حضرت مولانا ذکریا شیخ الحدیث سے بیعت تھے، میں نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین کو مطلع کر دیا ہے۔ اور ایصال ثواب کیلئے بھی عرض کر دیا ہے، آپ بھی، اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے۔　والسّلام

اخلاق حسین۔ دہلوی

ادبیات

آہ! سیّد صباح الدین!!

از جناب اثر انصاری مئو

اٹھ گیا اک داستانِ کیف و کم کا رازداں
بجھ گیا اک علم و دانش کا چراغِ ضو فشاں

کون بتلائے گا اب گم کردہ منزل کا نشاں
کون دہرائے گا تاریخِ امم کی داستاں

اک مورخ، اک محقق اک مفکر چل بسا
جانشینِ شبلی و سیّد بھی آخر چل بسا

راستے میں گر پڑا شاخِ بریدہ کی طرح
موت بھی آئی تو آہوئے رمیدہ کی طرح

بزمِ ہستی میں رہا برقِ تپیدہ کی طرح
رُل گیا پھر خاک میں اشکِ چکیدہ کی طرح

چن لیا دستِ فنا نے باغِ سرسیّد کا پھول
بادِ صرصر نے اڑا دی گلشنِ شبلی میں دھول

تیرے جیسا صاحبِ تدبیر و حکمت اب کہاں
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا کوئی تاریخ داں

اب میسر ہے کسے تیرا قلم، تیری زباں
تیرا اندازِ تکلّم، تیرا اندازِ بیاں

کیا خبر تیرے تعاقب میں ہے مرگِ ناگہاں
آہ! اے سیّد صباح الدینؒ میرِ کارواں

تھی کبھی مجھ سے مخاطب تیری چشمِ التفات
اب بھی کانوں میں مرے رس گھولتی ہے تیری بات

اب کسے جاکر سناؤں اپنے دل کی واردات
تو بھی رخصت ہوگیا اے جادہ پیمائے حیات

یہ نہیں کہ صرف اکیلا ہی اثر رنجیدہ ہے
تیرے غم میں ہر رفیقِ معتبر رنجیدہ ہے

سونا سونا آج شبلیؒ کا دبستاں ہوگیا
دھندلا دھندلا نقش محرابِ سلیماں ہوگیا

منتشر شیرازۂ نظمِ گلستاں ہوگیا
یہ چمن زارِ محبت کشت ویراں ہوگیا

نام لیوا اٹھ گیا شاہ معین الدینؒ کا
فرطِ غم سے زرد ہے چہرہ ضیاء الدینؒ کا

ایک ناممکن سی شے ہے دہرِ فانی میں ثبات
ایک امرِ بالیقیں ہے موت، انجامِ حیات

لمحہ لمحہ زندگی کا ہے اسیرِ حادثات
ٹوٹ جائے گا کسی دن خود طلسمِ کائنات

تو نہیں لیکن تری تحریر تو رخشندہ ہے
صفحۂ تاریخ میں تو زندہ و پائندہ ہے

قطعۂ تاریخ وفات سید صباح الدین صاحب مرحوم

از جناب مولانا محمد عثمان صاحب (پورہ معروف)

آہ! اے سید صباح الدین زعیمِ نیک نام
حادثہ کی موت تیری ہے شہادت لاکلام

کس قدر اعزاز بخشا ہے خدائے پاک نے
قدسیاں ہیں محوِ حیرت دیکھ کر تیرا مقام

علم و فن نازاں تھا تیری ذات گوہر بار پر
اے حریمِ قدس کے رونق فزا ماہِ تمام

تیری تالیفات تاریخی و علمی ہیں گواہ
علم و فن میں کس قدر اونچا رہا تیرا مقام

کہہ دے عثمانؔ سالِ رحلت شاہ و ولی ذوالاحترام
۱۹۸۷ء

پُر سکوں مسکن وطن ہے جنت دارالسلام
۱۴۰۸ھ

مطبوعاتِ جدیدہ

ہندوستانی مسلمان

عصری دستاویزات کے آئینے میں، علی گڑھ تحریک جلد اول { متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۰ مجلد، قیمت ۵۰ روپیے۔ پتے (۱) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ہندوستان کے مسلمان آزادی کے بعد جن حالات و مسائل سے دوچار ہوئے ان میں انکا میلان سیاست کی جانب اتنا زیادہ رہا کہ اس کے شور و غوغا میں ان کے دوسرے افکار کی کوئی صدا سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اس کتاب کا مقصد عہد حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری کاوشوں کی دستاویز پیش کرنا ہے۔ اس کی یہ پہلی جلد علی گڑھ تحریک سے متعلق ہے۔ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کا راس المال ہے۔ اس سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں، علی گڑھ تحریک نے ہر دور میں مسلمانوں کی ذہنی و دماغی تربیت کے علاوہ علمی، مذہبی، فکری، تہذیبی اور معاشی دائروں میں بھی رہنمائی کی ہے۔ اس جلد میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی علی گڑھ تحریک خصوصاً ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۸ء تک کے افکار کو قلمبند کیا گیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کے شروع میں مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم کی مختلف پر مغز، موثر اور مفید تحریروں اور خطوط کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، ان کا مقصد تحریک کے اغراض و مقاصد کو نمایاں کرنا ہے، اسی سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی وہ تاریخی تقریر درج ہے جو آزادی کے بعد دہلی کی

جامع مسجد میں کی گئی تھی، اور مسلم یونیورسٹی میں دیا جانے والا مولانا کا خطبۂ تقسیم اسناد بھی دیا ہے، دونوں خطبے اہم اور مسلمانوں کے لیے دعوت فکر ہیں۔ جناب سید حامد کے دور ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی بازیافت کا نیا سلسلہ شروع ہوا تو تہذیب الاخلاق کا بھی دوبارہ اجرا عمل میں آیا، شروع ہی میں اس کے کچھ مفید، سنجیدہ اور قابل غور اداریے نقل کیے گئے ہیں، ان میں مسلمانوں کی بروقت فکری، تہذیبی اور سماجی رہنمائی کی گئی ہے، اور مسلمانوں کو وقت و حالات سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، اس کے بعد علی گڑھ تحریک سے وابستہ اشخاص کے مضامین شامل کئے گئے ہیں، جن میں مختلف حیثیتوں سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے امور و مسائل اور موجودہ حالات میں ان کی ترقی و کامرانی کے امکانات و وسائل پر بحث کی گئی ہے، اور انھیں اپنے پر عظمت ماضی سے درخشاں مستقبل کی تعمیر کی تلقین کی گئی ہے۔

گو یہ سب مضامین سنجیدہ ہیں جو غور و فکر سے لکھے گئے ہیں، تاہم ان میں ظاہر کئے گئے تمام خیالات سے ہر شخص کا اتفاق ضروری نہیں ہے، دوسرا حصہ جناب سید حامد کے مقالات و خطبات کے لیے مخصوص ہے، اس کی ابتدا اس توسیعی خطبہ سے کی گئی ہے، جو خدا بخش خاں لائبریری میں علی گڑھ تحریک کے موضوع پر دیا گیا تھا، اس میں تحریک کے ابتدائی واقعات و حالات کے ذکر میں سرسید کے ساتھ مسلمانوں کے غیر مناسب رویے کا تذکرہ بھی آگیا ہے، پھر تحریک کی اہمیت، ضرورت، خصوصیت، معنویت اور اس کے وسیع فیضان وغیرہ کی تفصیل پیش کر کے اس کے خط و خال کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے، علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کے لیے اس خطبہ کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے، پھر سید حامد کے درجنوں مضامین درج ہیں، جو مختصر ہونے کے باوجود مفید اور فکر انگیز ہیں، ان میں مسلمانوں کی موجودہ ابتر صورت حال اور ذہن و مزاج کی بگڑی ہوئی کیفیت کا منصفانہ تجزیہ کر کے ان کی مناسب رہنمائی کی گئی ہے، سید صاحب نے مسلمانوں کے

فکر و نظر کے انتشار، شیرازۂ ملت کی برہمی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے خلل ہی کی نشاندہی نہیں کی ہے، بلکہ ان کی اصلاح کی صورتیں بھی بتائی ہیں، اور تعمیر و ترقی کی صحیح راہ پر گامزن ہونے کے زریں مشورے بھی دئے ہیں، یہ مضامین بڑی دلسوزی، دردمندی، اخلاص اور صداقت سے لکھے گئے ہیں۔ اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا نمونہ ہیں، تیسرے حصہ میں حامد صاحب کے اسی نوعیت کے چند مفید اور قابل توجہ انگریزی مضامین درج ہیں، یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد خصوصاً سید حامد کے دور کی علی گڑھ تحریک کی ایک اچھی فکری دستاویز ہے، اس کی اشاعت ایک مفید علمی، قومی اور ملی خدمت ہے، شروع میں خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار کی افتتاحی تحریر بھی ان کے مخصوص طرز کی وجہ سے پرکشش ہو گئی ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کی فکر کا اچھا تجزیہ کیا گیا ہے، اور علی گڑھ تحریک کی اجمالی سرگذشت قلمبند کی گئی ہے، اس ضمن میں دوسرا رخ بھی زیر بحث آیا ہے۔ جس میں علی گڑھ سے وابستہ مفاد پسند اور ناپسندیدہ عناصر کے رویے اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے نشیب و فراز کا ذکر کیا ہے، البتہ صفحہ ۱۰۱ پر بین مذہبی مناکحت کے ذکر میں ہندوؤں کے شبہ اہل کتاب ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے، مگر ظاہر ہے شبہ اہل کتاب سے بعینہ اہل کتاب جیسا معاملہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے اس کی وجہ سے بین مذہبی مناکحت پر استدلال درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل کتاب کے مردوں سے مسلم عورتوں کے نکاح کی کوئی رخصت و اجازت نہیں دی گئی ہے، غنیمت ہے کہ خود مقدمہ نگار کو یہ تسلیم ہے کہ "بین مذہبی مناکحت بحالات موجودہ مناسب یقیناً نہیں ہے"۔ ان کی تحریر میں کئی جگہ عصری اسلام کا لفظ بھی آیا ہے، اسلام تو ہر زمانہ میں ایک ہی رہا ہے، ایسی صورت میں اس قسم کے الفاظ سے خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے احتراز لازمی ہے، "ض"

عمرِ رائیگاں :- از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، صفحات ۸۰، طباعت اعلیٰ قسم کی آفسیٹ پر،
پتہ: گلستان پبلشنگ ہاؤس، ۸، یونیورسٹی روڈ، دہلی ۷۔ آرٹ پیپر پر ۸ صفحوں میں تصویریں۔

خود نوشت سوانح عمری لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، واقعہ نگاری کے ساتھ اپنی ذات کو خودستائی کے حدود سے الگ رکھنا، واقعات کے بیان میں اہم اور غیر اہم کے درمیان حد فاصل رکھنا، توازن قائم کرنا، انداز بیان کو اکتاہٹ سے بچانا، ان خار داروادیوں سے مصنف کو بڑی احتیاط سے گزرنا پڑتا ہے، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی خودنوشت سوانح عمری جسے وہ "عمرِ رائیگاں" کہتے ہیں، یہی احتیاط روی ممتاز کرتی ہے۔

خواجہ صاحب چاہتے تو ان کی روداد زندگی جس کے اشارے خفی حروف میں چار صفحوں پر پھیلے ہیں، آسانی سے ڈھائی تین سو صفحات میں آسکتی تھی، اس کے بجائے انھوں نے اپنی ستّر سالہ زندگی کی کہانی (جسے وہ مضمون کہتے ہیں) صرف ۸۰ صفحوں میں بیان کر دی، یہ ان کی کسر نفسی بھی ہے۔ اور ایجاز کا کرشمہ بھی، خاندانی حالات لکھے تو غیر ضروری اندراج سے پرہیز کیا، جاہ وحشمت یا فخر و مباہات سے گریز کیا۔

خواجہ احمد فاروقی نے اردو اور فارسی کے ساتھ انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں بڑے بڑے یوروپین محققین اور تنقید نگاروں کے نام تو نہیں لیتے ہیں لیکن ان کے اثرات کو اپنی تحریر میں نہایت خوبی سے سموتے ہیں۔ ان کی تحریر پر شور آبشار کی روانی کی طرح نہیں، ایک صاف شفاف سبک خرام ندی کی جیسی ہوتی ہے، جس کے کناروں پر جابجا شاداب پھولوں کے ترشے ہوئے پودے آراستہ ہوں۔ الفاظ کا انتخاب، ترکیبیں اور نشست، لہجہ کی نرمی، ان کی انفرادیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ "تضییع اوقات" کا اچھوتا انداز بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں، "میں نے واقعی بہت تضییع اوقات کیا ہے، اور ذرا ذرا سے کام میں ہفتے اور مہینے اور سال لگا دیے ہیں، میں نے اس کاہلی کی وجہ جواز عجیب عجیب طرح نکالی ہے اور اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا ہے کہ اگر اچھا کام کرنا ہے تو وہ عجلت میں نہیں ہو سکتا، اس پر سوچنا۔ اور غور کرنا ضروری ہے۔" اس طرح پہلے وہ تخلیقی موقف میں مرکزی نقطے کی تلاش کرتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطالب کی عالمانہ ترسیل کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب اپنے آپ کو پرانی وضع کا کمزور آدمی بتاتے ہیں، ان کی یہی وضع داری انھیں "صراط مستقیم" پر چلاتی ہے، اور انھیں بعض وقت یہ احساس دلانے پر مجبور کرتی ہے کہ الف لیلہ کی کہانی کی طرح اگر میں سیدھے راستے سے ہٹ گیا تو پتھر کا ہو جاؤں گا۔ اور یہی وہ راستہ تھا، جو انھیں درس و تدریس، تحقیق و تصنیف کی طرف لے گیا، اس راستے پر چلنے کے لیے انھوں نے اپنی تربیت کس طرح کی وہ بھی نصیحت آموز ہے، بقول ان کے "ادعائے کمال یا بے عیبی ایک طرح کی بیماری ہے جو اس رواں دواں دنیا میں عیب کے مترادف ہے۔" کاش اور لے دوڑ کی مثال پر عمل کرنے والے نئی نسل کے لکھنے والے کاش اس طنز کو سمجھ سکیں۔

اپنی مختصر سی کتاب میں، اسے کتابچہ کہہ کر اس کی توہین نہیں کروں گا۔ خواجہ صاحب بہت سی موقر شخصیتوں کی صحبتوں کا ذکر کرتے ہیں، پرانے قلعے میں پناہ گزینوں کے کیمپ میں فسادات کے دوران اپنے قیام کا حال بیان کیا ہے، ان سب میں حقیقت بھی ہے۔ اور حسرت بھی، لیکن پیرایہ لطیف ہے، جو ان کا خاص انداز ہے، ان کی ملاقاتیں یقیناً بے شمار نامور ادیبوں اور دانشوروں سے ہوئی ہوں گی؛ لیکن اپنے مضمون سے متعلق ہی ناموں کا ذکر کرتے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تصنیف و تالیف، توسیعی خطبات، تحقیق اور اشاعتی پروگرام کے سلسلے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی جو خدمات رہیں ان کے ذکر کے ساتھ وہ اپنی کتاب اس طرح ختم کرتے ہیں۔

"جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اردو زبان و ادب کے کتنے گوشے توجہ کے مستحق ہیں، تو مجھے اپنا یہ سارا کام بہت حقیر معلوم ہوتا ہے، میں نے اندھیرے میں مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا جلانے کی کوشش کی ہے"۔ یہ اگر حقیقت بھی ہو تو یہ بھی سچ ہے کہ اس دیے کی روشنی دور دور تک پہنچی ہے۔ (ش۔ د)

مکاتیب ریاضیہ :۔ مرتبہ جناب ظفر کمالی صاحب۔ تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۱۶، قیمت ۳۰ روپے پتے۔ (۱) مدرسہ عربیہ سراج العلوم تہہ بازار سیوان۔ (۲) بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴۔

مولانا ریاض احمد صاحب مرحوم ضلع چمپارن کے ایک صاحب درس و ارشاد بزرگ تھے، ان کے علاقے کے لوگوں کو ان کی ذات سے بڑا فیض پہنچا، درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کی مشغولیتوں کی وجہ سے انھیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا، مگر انھوں نے اپنے تلامذہ و مسترشدین کو جو اصلاحی و تربیتی خطوط لکھے تھے اب مولانا کے قدر دانوں نے ان کا یہ منتخب مجموعہ عام فائدہ کے لیے شائع کیا ہے، ان مکاتیب میں تصوف و سلوک کے نکات اور اصلاح باطن کے زریں مشورے دیے گئے ہیں، شروع میں مختلف ارباب قلم نے مولانائے مرحوم کے حالات و کمالات اور مکاتیب کی خصوصیات تحریر کی ہیں، اور آخر میں جناب وارث ریاضی کا منظوم خراج عقیدت درج ہے، اس سے اور مولانا پر لکھے گئے مضامین سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

نغمات اسلام :۔ از جناب ابوسلیم عبدالعلیم آہبر، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت ۳ روپے پتہ سلیم بکڈپو سمرا، پوسٹ سمری خانکوٹ، ضلع بستی، یو۔پی

مولوی ابوسلیم عبدالعلیم آہبر بستوی کو شعر و سخن سے مناسبت ہے، یہ ان کی دینی و مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے جس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، ابتدا میں حمد و نعت سے متعلق اور آخر میں دوسرے دینی، قومی، اصلاحی اور اخلاقی موضوع پر نظمیں ہیں، ان سب سے مصنف کے سنجیدہ ذوق اور دینی و اسلامی جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کو اپنی مشق و ریاض جاری رکھنی چاہئے تاکہ کلام میں مزید پختگی اور جلا پیدا ہو۔ "ض"

جلد ۱۴۱ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۸ء عدد ۲

مضامین